اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ربیع الاول ۱۴۴۳ھ، اکتوبر ۲۰۲۱ء

النخیل

کراچی

بانی

ابن الحسن عبّاسی

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۲ ربیع الاول ۱۴۴۳ھ، اکتوبر ۲۰۲۱ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 60روپے **سالانہ زرِتعاون :**.... 600 روپے

خط وکتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷/ دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس:alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

مدیر کے قلم سے

آج کی نوجوان نسل کے سامنے سب سے اہم سوال اپنے مقصدِ زندگی کے تعین کا ہوتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ معرفتِ الٰہیہ یعنی اپنے خالق و مالک کی پہچان اور اس مالک کی مرضی و منشا کے مطابق زندگی گزارنا ہی بنی نوع انسان کی دارین کی کامیابی کی کلید ہے۔ فارسی کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

روح پدرم شاد کہ او گفتہ بہ استاد فرزند مارا عشق بیاموز ودیگر ہیچ!

(میرے باپ کی روح شاد رہے کہ اس نے میرے استاد سے کہا تھا، میرے فرزند کو بس عشق سکھا دیں اور کچھ نہیں!)

جس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی اور اپنا مقصدِ حیات پا لیا، وہی شاہراہ زندگی کا کامیاب مسافر ہوگا۔ اب معرفت الٰہیہ کا حصول کیسے ہو؟ اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام کی صورت میں ایک شاندار تحفہ عطا فرمایا ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے پاس اور جتنی بھی دیگر نعمتیں ہیں مثلاً ہماری یہ زمین، آسمان، چاند ستارے اور خود ہمارا اپنا وجود، یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، جبکہ قرآن کریم وہ نعمت ہے جو جمہورِ امت کے نزدیک اللہ کی مخلوق نہیں بلکہ خود اس کی ذات وصفات کا ایک حصہ اور مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں قرآن کریم کو ''حبل اللہ المتین'' یعنی اللہ کی ایک مضبوط رسی سے تعبیر کیا گیا ہے اور ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعا'' میں بھی ''حبل اللہ'' کی تفسیر مفسرین نے ''کلام اللہ'' سے ہی کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص آج کے دور میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہونا اور معرفت الٰہیہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ قرآن کریم ہی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ قرآن سے وابستہ ہوگا، اتنی ہی وابستگی اسے اللہ تعالیٰ سے حاصل ہو جائے گی۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا وہ لازوال ابدی و آفاقی کلام ہے جو

ہر دور کے انسان کی جملہ روحانی و مادی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کچھ نعمتیں ایسی ہیں جن کی اہمیت وافادیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوتی۔ مثلاً پانی کو ہی لے لیجیے، حضرت انسان نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے طرح طرح کے مشروبات بنائے ہوئے ہیں لیکن پانی کی ضرورت وافادیت آج بھی اسی طرح ہے جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھی۔ اسی طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ آکسیجن ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی تمام تر ترقی کے باوجود کوئی چیز آکسیجن کا متبادل نہیں بن سکتی۔ بالکل اسی طرح قرآن کریم بھی انسان کی روحانی زندگی کی وہ ضرورت ہے جس کا کوئی متبادل نہیں ہے اور کسی بھی دور میں اس کی اہمیت وفادیت کم نہیں ہوسکتی۔ آج کوئی بھی شخص صبح اٹھ کر جب قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کلام آج ہی اس کے آج کے مسائل کے حل کے لیے اترا ہے۔

آج کا دور عالمگیریت کا دور کہلاتا ہے جبکہ قرآن کریم کا پیغام بھی عالم گیر و آفاقی ہے۔ قرآن انسانیت کو ''اے لوگو!'' اور ''اے بنی آدم!'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے جس میں ہر خطے، ہر زبان اور ہر رنگ کے لوگ شامل ہیں۔ قرآن ہر دور کی کتاب ہے۔ افلاطون الٰہیات، فلکیات اور تخلیق کائنات سے متعلق اپنے جن شہرہ آفاق نظریات وخیالات کی وجہ سے ''افلاطون'' کہلاتا ہے اور ارسطو کو جن باتوں کی وجہ سے ''ارسطو'' کہا جاتا ہے، وہ نظریات اور باتیں آج اگر میٹرک کے کسی بچے کے سامنے بھی بیان کی جائیں تو وہ ان میں سے بیشتر باتوں کو جھٹلا دے گا اور ان پر ہنسے گا کیونکہ سائنس کے ارتقا نے ان باتوں کو کلی اور حتمی طور پر غلط ثابت کر دیا ہے، مگر قرآن کریم نے انہی مشکل ترین موضوعات سے متعلق جو حقائق آج سے چودہ سو سال قبل بیان کیے تھے، وہ آج بھی نہ صرف اپنی حقانیت کو منوا رہے ہیں بلکہ انسانیت کی رہنمائی بھی کر رہے ہیں۔

''قرآن اور سائنس'' ایک مستقل موضوع ہے جس پر بات کرنا یہاں مقصود نہیں ہے، ہر نئے سائنسی نظریے کے لیے قرآن سے موافقت تلاش کرنے کے علمی طرزِ عمل پر کلام بھی کیا جا سکتا ہے، مگر میں صرف ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ تخلیق کائنات سے متعلق سائنس کا جو تازہ ترین اور مقبول ترین نظریہ ہے، جسے big bang کا نظریہ کہا جاتا ہے، اس سے آگاہی رکھنے والا سائنس کا

طالب علم جب قرآن پڑھتا ہے تو اسے اس نظریے کی قرآن کریم کی اس آیت سے حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے کہ (ترجمہ) ''کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان اور زمین ''منہ بند'' تھے، پھر ہم نے ان کو کھول دیا......'' (الانبیاء:۹۷) گویا کہ آج کے سائنس نے صدیوں کے ارتقا کا سفر طے کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس کی طرف قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے رہنمائی کی تھی۔

بات صرف سائنس تک محدود نہیں ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت اور سماجیات سے متعلق چند باتیں ایسی ہیں جو آج بین الاقوامی سطح پر ''مسلمہ'' کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً انسانیت تاریخ کے تلخ ترین تجربات اور ہر طرح کی بادشاہتوں، آمریتوں اور شخصی و گروہی حکمرانیوں کی تباہ کاریاں دیکھنے کے بعد اس بات پر اتفاق کر چکی ہے کہ ملکوں اور قوموں کے فیصلے ''اجتماعی دانش'' سے کرنا ہی بہترین سیاسی نظام ہے۔ اسے جمہوریت کہہ لیں یا کچھ اور نام دیں، تعبیر اور تشریح میں فرق ہو سکتا ہے، مگر دنیا کی بیشتر قوموں نے اسے ہی ایک بہتر سیاسی نظام قرار دے کر اپنایا ہوا ہے۔ قرآن کریم آج سے چودہ سال پہلے صرف تین لفظوں میں اس مسئلے کو حل کر چکا ہے کہ ''امرھم شوریٰ بینھم'' (الشوریٰ) کہ مسلمانوں کا ''امر'' باہمی مشاورت سے طے ہوتا ہے۔ عربی زبان جاننے والے واقف ہیں کہ عربی محاورے میں ''امر'' عام طور پر نظم مملکت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح آج کی دنیا کا ایک مسلمہ یہ ہے کہ دنیا میں نسلی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ رنگ، نسل، زبان کی بنیاد پر کسی انسان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے صدیوں پہلے ہر قسم کے نسلی امتیاز کا قلع قمع کر دیا تھا۔ سورہ حجرات آیت نمبر ۱۳ میں فرمایا گیا کہ (ترجمہ) ''اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ تمہارے آپس کی پہچان ہو، تحقیق عزت اللہ کے ہاں اس کی بڑی ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہو۔ خبردار اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''

آج کی دنیا میں ایک بات یہ بھی زور دے کر کہی جاتی ہے کہ انسانوں کے درمیان صنفی امتیاز نہیں ہونا چاہیے، یعنی مردوں اور عورتوں میں تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ صنفی مساوات کے مفہوم اور مقصد سے متعلق جو خلط مبحث کیا جاتا ہے اور خاص طور مغرب نے آزادی نسواں کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ بجائے خود حیرتوں اور تضادات کا ایک باب ہے، مگر اسلام نے مرد اور عورت کے دائرہ کار کو الگ الگ رکھتے ہوئے دونوں کو

اپنی اپنی جگہ پر برابر حقوق دیئے ہیں۔سورہ النحل آیت نمبر ۹۷ میں واضح ارشاد ہے(ترجمہ) ’’جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہے تو اس کو ہم دیں گے ایک اچھی زندگی اور بدلے میں دیں گے حق ان کو بہتر کاموں پر جو وہ کرتے تھے۔‘‘

یہ بڑی دل چسپ بات ہے کہ جس وقت قرآن نازل ہورہا تھا،احادیث میں آتا ہے کہ اسی زمانے میں کچھ مسلمان خواتین نے یہ سوال اٹھایا تھا(خواتین اپنے حقوق کے بارے میں ہمیشہ سے حساس واقع ہوئی ہیں) کہ قران کریم میں مذکر کے صیغے سے مردوں کا مخاطب کیا جاتا ہے،ہم عورتوں کا ذکر نہیں آتا حالانکہ اصولا یہ سوال بنتا نہیں ہے کیونکہ دنیا میں ہر طرح کے حکم نامے مذکر کے صیغوں میں ہی جاری کیے جاتے ہیں اور عورتیں اس میں شامل ہی ہوتی ہیں،مگر قرآن کریم نے قیامت تک آنے والی خواتین کو اس ’’اشکال‘‘ سے بچانے کے لیے ایک لمبی آیت نازل کی جس میں مومنین کے ساتھ مومنات، مسلمین کے ساتھ مسلمات، صالحین کے ساتھ صالحات، صابرین کے ساتھ صابرات وغیرہ......کا تذکرہ کرکے دونوں کے لیے برابر کے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے،جس کا مطلب ہے کہ اعمال واخلاق کی میزان میں دونوں کے کردار کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔اسی طرح آج دنیا سرمایہ داریت اور سودی معیشت سے تنگ آچکی ہے جبکہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے سودی معیشت کو انسانیت کے لیے زہر قاتل قرار دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن ہر دور کی طرح دور حاضر کی بھی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اسی میں عالمِ انسانیت کے سارے مسائل کا حل موجود ہے۔جتنی جلد انسانیت اس حقیقت کو پالے گی،امن وسکون بھی حاصل کرسکے گی۔بقول اقبال ؎

وہی نامحکمی دل کی وہی دیرینہ بیماری علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۲۰ ربیع الاول ۱۴۴۳ھ

☆......☆......☆

سوزِ دل

ادھورا نقشہ

ابن الحسن عباسی

پاکستان کو اپنے خوابوں کی منزل اور خیالوں کا دیس سمجھ کر اس کی طرف ہجرت کرنے والے، جانے کتنے لٹے پٹے قافلے تھے جو گردوں کے ستم اور اجڑے ہوئے گھر دیکھ کر یہاں پہنچے لیکن ایک ٹھیٹھ اسلامی حکومت کا نقشہ انہیں دکھائی نہ دیا، گمنام قافلوں کے روپوش کارکنوں کو تو رہنے دیں، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا حال سنیے جو تحریک پاکستان کے سرخیل حامی علماء میں سے تھے، ان کے لہجے، ان کی تحریر کے درد و کرب کی یہ سطریں پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

> ”میرے استاد محترم اور پھوپھی زاد بھائی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور چند عمائد کراچی نے یہ ارادہ کیا کہ پاکستان کے لیے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کر کے حکومت کے سامنے رکھا جائے تاکہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا ہے، وہ جلد سے جلد بروئے کار آسکے، اس تجویز کے لیے من جملہ چند علماء کے احقر کو بھی ہندوستان سے کراچی آنے کی دعوت دی گئی ...... یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا، جس میں وطن مالوف، مرکز علوم دیوبند کو خیر باد کہہ کر پاکستان کا رخ کیا، والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر اور جس طرف جا رہا ہوں، وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گذارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن امیدوں کے ملے جلے تصورات میں غلطاں...... یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں، اس پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا؟ اس کی سرگزشت بہت طویل ہے، یہ مقام اس کے لکھنے کا

نہیں، جن مقاصد کے لیے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لیے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی:

بلبل ہمہ تن خون شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این ست بہارے

حکومت کے راستے سے کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، تاہم عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور امورِ دین کا احساس بحمد اللہ ابھی تک سرمایہ زندگی بنا ہوا ہے، ان میں صلاح و تقویٰ کی بحمد اللہ خاصی تعداد موجود ہے، اسی احساس نے یہاں دینی خدمتوں کی راہیں کھولی ہوئی ہیں۔

(معارف القران، جلد اول، صفحہ ۶۳)

یہ غالباً ان ہی مخلص مسلمانوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ بے دین حکمرانوں، بدعنوان سیاست دانوں اور غیر ذمہ دار بیوروکریسی کے باوجود پاکستان عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بنا...... دین کی نشر و اشاعت اور اسلامی علوم کی مرکزیت کا اعزاز اسے حاصل ہوا...... جہاد کا جذبہ یہیں سے زندہ ہوا اور اسلام کی پناہ گاہ کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا...... جو مسلمان زعماء پاکستان بنانے کے مخالف تھے، پاکستان بن جانے کے بعد اس کی حفاظت کو وہ ضروری خیال کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ مسجد بنانے کی جگہ میں اختلاف تھا، اب جب مسجد بن گئی، اس کی حفاظت ہم سب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، بلاشبہ پاکستان کی ۷۰ سالہ تاریخ میں آنسو بھی ہیں اور مسکراہٹیں بھی، غم بھی ہیں اور مسرتیں بھی......اور ایسے ان گنت درد مند پاکستانی مسلمانوں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی، جن کی آنکھوں میں پاکستان کے ہر غم پر آنسو اور جن کے دل میں پاکستان کی ہر مسرت پر آس کا چراغ جھلملانے لگتا ہے، ان شاء اللہ ایک دن ان کی تمنا بھی بر آئے گی اور ”ادھورا نقشہ“ تکمیل کی منزل پالے گا!!

(انتخاب از قلم نما)

☆......☆......☆

علم وتحقیق

علماءِ احناف اور علمِ حدیث

مولانا محمد الیاس البلوشی

المتخصص فی علوم الحدیث، جامعہ بنوری ٹاؤن

خلاّق عالم، رب کائنات نے انسانوں تک اپنی ربوبیت آشکارا کرنے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار رُسل وانبیاء کرام علیہم السلام کا انتخاب فرمایا، ہر نبی ورسول کسی خاص قبیلہ، قوم، علاقہ یا زبان والوں کی طرف بھیجا گیا، سوائے خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے، کہ انہیں قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا اور رب لم یزل نے امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایسے ساتھی عطا فرمائے، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان "بلّغوا عنّی ولو آیة" پر عمل کرتے ہوئے اپنی اگلی نسل تک دین کو پہنچایا اور دین کی خاطر اپنی جان اور اموال کا نذرانہ پیش کیا اور اُن کے بعد آنے والے ہر طبقہ اور ہر زمانہ میں رب کائنات نے ایسے رجال پیدا فرمائے، جنہوں نے دین کی حفاظت کو اپنا فرض اوّل سمجھا اور شریعتِ مطہرہ کے لیے اپنے آپ کو ہمہ وقت وقف کیا، اُن رجال میں سے چار وہ ہیں جنہیں ائمہ اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جنہوں نے قرآن وحدیث کو سمجھانے اور عمل کرانے کے لیے اصول قائم کئے اور اُن اُصولوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی تشریح کی اور مسائل استنباط کئے اور آج سارے جہان میں ان کے متّبعین اور مقلدین پائے جاتے ہیں۔

ان چاروں ائمہ میں سے سب سے بڑے امام، امامِ اعظم نعمان بن ثابت ابوحنیفہؒ ہیں، جنہوں نے فقہ کی تدوین کا باقاعدہ آغاز فرمایا اور اپنے بعد کے آنے والے لوگوں کے لیے ڈھیروں آسانیاں پیدا کیں اور ایسے شاگرد تیار کئے جو زمین کے طول وعرض میں پھیلے اور دین کے ہر شعبہ میں نمایاں

کارنامے انجام دیئے، جہاں وہ فقہ کی خدمت میں سب سے پیش پیش رہے، وہاں وہ علم حدیث کی خدمت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور عوام کی خدمت کے لیے شریعت کو آسان انداز میں پیش کرنے کے لیے دن رات ایک کر کے مسائل کے استنباط میں مصروف عمل رہے، ان کے اس استنباط کی مصروفیت کو دیکھ کر بعض ناواقف لوگوں نے احناف پر اعتراض کیا کہ ان کے پاس کوئی حدیث نہیں اور یہ صرف قیاس پر عمل کرتے ہیں، صرف اس پر بس نہیں بلکہ مزید برآں یہ کہا کہ ان کے امام کے پاس صرف سترہ احادیث تھیں، ذیل میں احناف کی علم حدیث میں خدمات ملاحظہ کرنے سے یہ عیاں ہوگا کہ احناف کا علم حدیث میں کیا مقام ہے۔

امام ابوحنیفہ اور علمِ حدیث: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اپنے زمانے کے نامور محدثین میں سے تھے، علامہ ذہبیؒ (ت:۷۴۸ھ) (۱) اور علامہ سیوطیؒ (ت:۹۱۱ھ) (۲) نے آپؒ کو حفاظ میں شمار کیا ہے، جبکہ علامہ عجلیؒ (ت:۲۶۱ھ) (۳) اور علامہ ابن شاہینؒ (ت:۳۸۵ھ) (۴) نے آپؒ کا شمار ثقات میں کیا ہے۔

آپؒ کے شیوخ کی تعداد امام موفق بن احمد مکیؒ (ت:۵۶۸ھ) نے چار ہزار سے زائد بتائی ہے، (۵) جبکہ آپ کے شاگردوں کی تعداد کے متعلق علامہ ذہبیؒ (ت:۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

"روی عنه من المحدثین و الفقهاء عدة لا یحصون" (٦)

ترجمہ: "آپؒ سے اتنے محدثین اور فقہاء نے روایت کی ہے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔"

اور علامہ کردریؒ (ت:۸۲۷ھ) نے آپ کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ذکر کی ہے، جن کی تعداد ساڑھے آٹھ سو ہے اور ان کو شہروں کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے جن میں تینتالیس شہروں کے اسماء رقم ہیں (۷)۔ آپ رحمہ اللہ کو چاروں ائمہ میں یہ شرف حاصل ہے کہ آپؒ تابعی ہیں اور آپؒ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بالمشافہ روایات سنی ہیں، علامہ خوارزمیؒ (ت:٦٦٥ھ) نے "جامع المسانید" میں آپؒ کی سات صحابہ رضی اللہ عنہم سے دس روایات ذکر کی ہیں۔

محدثینِ عظام کے نزدیک علوسند ہمیشہ ایک قابل فخر چیز سمجھی گئی ہے، کیونکہ روایت میں جس قدر واسطے کم ہوں گے، اسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرب زیادہ ہوگا، لہٰذا علوسند میں امام صاحب کی سند اپنے زمانہ کے بہت سارے علماء اور ائمہ اربعہ کی سند سے عالی ہے۔

وحدانیات (جس سند میں صرف ایک واسطہ ہو) کے بعد درجہ ثنائیات (جس سند میں صرف دو واسطہ ہوں) کا ہے، "جامع المسانید" میں امام صاحب کی ثنائیات کی تعداد اڑھائی سو ہے اور امام مالکؒ کی سب سے عالی سند ثنائیات ہیں، ان کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی روایت نہیں اور امام صاحبؒ کی ثلاثیات کی تعداد "جامع المسانید" میں ساڑھے چار سو ہے جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی کسی تابعی سے ملاقات نہ ہوسکی، اس لیے ان کی مرویات میں سب سے اونچا مقام "ثلاثیات" کا ہے۔

امام صاحب کی عالی اسناد والی احادیث ان کی علوّشان کو اپنے معاصرین سے بالکل نمایاں کرتی ہیں اور باقی ذخیرہ احادیث تو اس سے کہیں زیادہ ہیں جو کہ امام صاحب کی "کتاب الآثار" اور ان کی جمع کی گئی مسانید میں موجود ہیں چنانچہ صدر الائمۃ موفق بن احمد مکیؒ (ت: ۵۶۸ھ) نے "مناقب امام اعظم" میں امام صاحبؒ کے ذخیرہ احادیث کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے: "وانتخب أبو حنيفة رحمه الله تعالى الآثار من أربعين ألف حديث"۔

ترجمہ: "امام ابوحنیفہؒ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا۔" (۸)

اور صدر الائمۃ موفق بن احمد مکیؒ نے یحییٰ بن نصر بن حاجبؒ کے حوالہ سے امام صاحب کے مناقب میں لکھا ہے کہ: **سمعت أبا حنيفة يقول: "عندى صناديق من الحديث، ما أخرجتُ منها إلا اليسير الذى يُنتفع به" (۹)۔**

ترجمہ: "میں نے امام اعظمؒ کی زبانی سنا، وہ فرما رہے تھے کہ میرے پاس احادیث کے کئی صندوق ہیں، میں نے ان میں سے صرف تھوڑی سی حدیثیں نکالی ہیں جن سے انتفاع ہو۔"

پھر یہ بھی واضح رہے کہ امام صاحبؒ ہر کس و ناکس سے روایت نہیں لیتے تھے، بلکہ ثقہ اور معتبر لوگوں کی روایات کو بیان فرماتے، چنانچہ سفیان ثوریؒ (جسے علماء امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے ہیں) امام صاحب کے اس طرزِ عمل کی شہادت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "يأخذ بما صحّ عنده من الأحاديث التى كان يحملها الثقات وبالآخر من فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم" (۱۰)۔

ترجمہ: "امام صاحبؒ کا عمل ان روایات پر ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جن کے راوی ثقات ہوں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری فعل ہوتا ہے، اسی سے لیتے ہیں۔"

اسی طرح امام حسن بن صالح بن حیؒ سے بھی منقول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی صحیح حدیث منقول ہوتو امام صاحبؒ اُسی کو اختیار فرماتے (۱۱)۔

حدیث کا یہ عظیم الشان ذخیرہ امام صاحبؒ کا حدیث سے شدّت تعلق اور غیر معمولی اعتناء کو خوب واضح اور روشن کر دیتا ہے اور مذکورہ تمام باتیں امام صاحبؒ کے متعلق "مشت نمونہ از خروارے" کے طور پر ہیں، ورنہ امام صاحب کے علمِ حدیث میں مقام کو کئی جلدوں میں لکھا جا سکتا ہے۔

احناف اور صحاحِ ستہ: صحاحِ ستہ میں سب سے پہلا درجہ صحیح بخاری کا ہے، امام صاحب کی وفات کے ۱۰۶ سال بعد ۲۵۶ھ میں امام بخاریؒ انتقال کر گئے اور امام بخاریؒ کا شمار امام صاحب کے شاگردوں کے شاگرد یا ان کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (ت: ۱۴۰۲ھ) "لامع الدراری" کے مقدمہ میں صحیح بخاری کے ثلاثیات کے متعلق لکھتے ہیں (۱۲): صحیح بخاری میں احادیث ثلاثیات کل بائیس ہیں، جن میں سے بیس احادیث امام صاحب کے تلامذہ یا بالواسطہ تلامذہ سے منقول ہیں، چنانچہ ان میں سے گیارہ مکی بن ابراہیمؒ سے چھ ابو عاصم النبیلؒ سے اور تین محمد بن عبداللہ انصاریؒ سے مروی ہیں جو امام زفرؒ اور امام ابو یوسفؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ مولانا محمد زکریا صاحبؒ مزید فرماتے ہیں:

> ترجمہ: "امام ابو حنیفہؒ کی اکثر روایات ثلاثیات ہیں اور اُن میں سے بہت ساری ثنائیات بھی ہیں جیسا کہ امام صاحبؒ کی مسانید اور کتاب الآثار کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس میں وحدانیات بھی ہیں، کیونکہ امام صاحب کی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات اور سماع ثابت ہے۔" (۱۳)

امام بخاریؒ کے علاوہ باقی صحاح ستہ کے مصنّفین میں سے امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے بعض تبع تابعین کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اس لیے یہ اکابر بھی سند عالی کی اس فضیلت میں امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے ہم پلہ ہیں، امام مسلمؒ اور امام نسائیؒ کی کسی تبع تابعی سے ملاقات نہ ہو سکی، اس لیے ان کی سب سے عالی مرویات احادیث "رباعیات" ہیں۔

مولانا عبدالرشید نعمانیؒ (ت: ۱۴۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے "جامع سفیان" کا سماع اپنے

ہی وطن میں امام ابوحفص کبیرؒ سے کیا تھا اور اس کے علاوہ دیگر کتابیں بھی انہوں نے ابوحفص کبیرؒ سے سماع کی تھیں (۱۴)، چنانچہ خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں: قال محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي: "كنت عند أبي حفص أحمد بن حفص أسمع كتاب الجامع، جامع سفيان" (۱۵)۔

ترجمہ: امام بخاریؒ فرماتے ہیں: "میں ابوحفص (کبیر) احمد بن حفصؒ کے پاس جامع سفیان ثوری کا سماع کر رہا تھا۔"

اور امام ابوحفص کبیرؒ کے متعلق علامہ عبدالقادر قرشیؒ (ت: ۷۷۵ھ) رقم طراز ہیں: "أخذ العلم عن محمد بن الحسن وله أصحاب لا يحصون" (۱۶)۔

ترجمہ: "ابوحفص کبیرؒ امام محمد بن الحسن شیبانیؒ کے شاگرد ہیں اور ان کے شاگرد شمار سے باہر ہیں۔"

پھر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ماوراء النہر کے پورے خطے میں فقہ کی اشاعت کی اور بخارا کا ہر ہر گاؤں ان کے تلامذہ سے بھرا ہوا تھا۔

اب اس سے امام صاحبؒ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کا اندازہ کیجئے کہ ان کو کس قدر مقبولیت حاصل تھی، دنیا کے ہر خطے میں ان علم کے شہسواروں نے فقہ اور حدیث کے ہر دو میدانوں میں بے مثل کارہائے نمایاں انجام دیئے، جو آج بھی کتبِ رجال اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور صحاحِ ستہ میں ایسے سینکڑوں راوی موجود ہیں جو امام صاحبؒ کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد تھے اور حنفی مسلک سے ان کا تعلق تھا، جن میں سے بہت سارے امام بخاریؒ کے اساتذہ یا اساتذہ کے اساتذہ تھے، یہاں ان کے اسماء ذکر کرنے کا مقام نہیں، ورنہ بحث بہت طویل ہو جائے گی، خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام بخاریؒ، اصحابِ صحاحِ ستہ اور دیگر محدثین عظام بھی ان مقتدایانِ امت کے مرہونِ منت ہیں، انہوں نے انہی ائمہ حدیث وفقہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے اور ان کے علوم کے سمندر سے اپنی علمی سیرابی کرتے رہے تا آنکہ خود اپنے دور کے سرتاج اور چشم و چراغ ہوئے۔

احناف اور علمِ جرح وتعدیل: علماءِ احناف نے جہاں فقہ میں چہار دانگِ عالم میں اپنا لوہا منوایا وہاں علمِ حدیث میں بھی انہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ علومِ حدیث میں سے ایک علم علمِ رجال اور جرح وتعدیل بھی ہے، اگر ہم جرح وتعدیل کے ابتدائی خدمات سرانجام دینے والے علماء پر نظر دوڑائیں تو ہمیں امام صاحبؒ اور ان کے شاگرد نمایاں نظر آئیں گے اور امام صاحبؒ رجال

اورعلمِ جرح وتعدیل پر بڑا اثر ورسوخ رکھتے تھے، بڑے بڑے علماء نے جرح وتعدیل کے باب میں رجال سے متعلق اُن کے کلام کو قبول کیا اور اسے سراہا، چنانچہ علامہ عبدالقادر قرشیؒ (ت: ۷۷۵ھ) امام صاحبؒ کی فنِ جرح وتعدیل میں قدر ومنزلت اور سیادت وامامت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: "اِس بات کو خوب سمجھ لیجئے کہ جرح وتعدیل میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے قبول کی گئی ہے اور اس فن کے (جاننے والے) ائمہ نے بھی اسے قبول کرکے اس پر عمل کیا (اور رُواۃ کی توثیق وتضعیف میں اُن آراء کو بطورِ استدلال پیش کیا) جیسا کہ انہوں نے ماہرین فن ائمہ امام احمدؒ، امام بخاریؒ، یحییٰ بن معینؒ اور علی بن المدینیؒ وغیرہ کی آرا کو قبول کیا (اور جرح وتعدیل کے بارے میں اس سے استدلال کرتے ہیں) اور یہی بات امام صاحبؒ کی سیادت، وسعتِ علمی اور عظمتِ شان سے واقفیت میں آپ کی راہنمائی کرے گی۔"(۱۷)

اور علامہ ذہبیؒ (ت: ۷۴۸ھ) نے "ذِكْرُ مَن يُعْتَمَدُ قولُه في الجرح و التعديل" اور علامہ سخاویؒ (ت: ۹۰۲ھ) نے "المُتَكَلِّمُون في الرّجال" کے عنوان سے رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے رجال پر کلام کرنے والے ائمہ کی فہرست ذکر کی ہے جن میں سے سرفہرست ائمہ میں ہمیں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد نظر آتے ہیں، ان میں سے صرف چند کے اسماءِ گرامی بطورِ مثال ملاحظہ ہوں:

شعبہ بن الحجاج، سفیان ثوری، مسعر بن کدام، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، یحیی بن سعید القطان، یحیی بن معین، عبدالعزیز بن ابی سلمہ، لیث بن سعد، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابراہیم بن طہمان، معافی بن عمران الموصلی، مکی بن ابراہیم۔

ان کے علاوہ علامہ ذہبی نے ایک بہت بڑی جماعت ذکر کی ہے جو امام صاحبؒ کے شاگرد تھے یا حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور علمِ حدیث سے شغف رکھنے والے حضرات بخوبی یہ بات جانتے ہیں کہ مذکورہ حضرات کا علم حدیث میں کیا مقام ہے اور ان میں سے اکثر حضرات وہ ہیں جن کی روایت سے متونِ حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں اور وہ صحاحِ ستہ کے راوی اور ان میں سے اکثر کے شیوخ ہیں اور ان مذکورہ حضرات میں سے اکثر وہ ہیں جن کے بارے میں خطیب بغدادیؒ (ت: ۴۶۳ھ) نے "الكفاية" (۱۸) میں یہ اصول ذکر کیا ہے کہ ان کی عدالت اتنی مشہور ہے کہ وہ کسی عالم کی تزکیہ کے محتاج نہیں۔

احناف اور تصانیفِ علمِ حدیث: اگر علمِ حدیث میں ائمہ احناف کی تمام تصانیف کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے، لہٰذا طوالت سے بچنے کے لیے یہاں صرف چیدہ چیدہ کتب کا بطور نمونہ تذکرہ کیا جائے گا تاکہ یہ بات عیاں ہوجائے کہ علمِ حدیث کی تصانیف میں بھی احناف کسی سے پیچھے نہیں، ملاحظہ فرمائیں:

☆...... **کتاب الآثار** (امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ، المتوفی ۱۵۰ھ)۔☆...... **مؤطا امام محمد** (ابوعبداللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ، المتوفی ۱۸۹ھ)۔☆...... **مصنف عبد الرزاق** (ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری الصنعانیؒ، المتوفی ۲۱۱ھ)۔☆...... **تاریخ یحییٰ بن معین** (ابوزکریا یحیی بن معین بن عون البغدادی الحنفیؒ، المتوفی ۲۳۳ھ)۔☆...... **شرح معانی الآثار** (ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامۃ الازدی المصری المعروف بالطحاویؒ، المتوفی ۳۲۱ھ)۔☆...... **شرح مشکل الآثار** (یہ بھی امام طحاویؒ کی ہے)۔☆...... **شرح ابن ماجہ** (ابوعبداللہ، مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ البکجری المصری، علاء الدینؒ، المتوفی ۷۶۲ھ)۔☆...... **اکمال تھذیب الکمال** (یہ بھی علامہ مغلطائیؒ کی ہے)۔☆...... **الاشارۃ الی سیرۃ المصطفی وتاریخ من بعدہ من الخلفاء** (یہ بھی علامہ مغلطائیؒ کی ہے)۔☆...... **المختصر فی اصول الحدیث** (علی بن محمد بن علی الزین الشریف الجرجانیؒ، المتوفی ۸۱۶ھ)۔☆...... **عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری** (ابومحمد محمود بن احمد بن موسیٰ، بدر الدین العینیؒ، المتوفی ۸۵۵ھ)۔☆...... **شرح ابو داؤد** (یہ بھی علامہ عینیؒ کی ہے)۔☆...... **عِقْدُ الجُمَان فی تاریخ اھل الزمان** (یہ بھی علامہ عینیؒ کی ہے)۔☆...... **مغانی الاخیار فی شرح اسامی رجال معانی الآثار** (یہ بھی علامہ عینیؒ کی ہے)۔☆...... **المغنی فی ضبط اسماء الرجال** (علامہ محمد طاہر پٹنیؒ، المتوفی ۹۸۶ھ)۔
☆...... **مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح** (علی بن محمد ابوالحسن نورالدین الملا الہروی القاریؒ، المتوفی ۱۰۱۴ھ)۔☆...... **الاحادیث القدسیہ الاربعینیہ** (یہ بھی ملا علی قاریؒ کی ہے)۔
☆...... **الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ** (یہ بھی ملا علی قاریؒ کی ہے)۔
☆...... **حاشیۃ السندی علی سنن النسائی** (محمد بن عبدالہادی التھٹوی، نورالدین السندیؒ،

المتوفی ۱۱۳۸ھ)۔☆......حاشیة السندی علی سنن بن ماجة (یہ بھی علامہ سندھیؒ کی ہے) ☆......شرح اصول الحدیث (داؤد بن محمد القارصی الحنفیؒ، المتوفی ۱۱۶۰ھ)۔☆......ظفر الامانی (ابوالحسنات، محمد عبدالحی بن محمد عبدالحلیم الانصاری الکھنوی الہندیؒ، المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔ ☆......الآثار المرفوعه فی الاخبار الموضوعه (یہ بھی علامہ لکھنویؒ کی ہے)۔☆......الرفع والتکمیل (یہ بھی علامہ لکھنویؒ کی ہے)۔☆......فیض الباری علی صحیح البخاری (محمد انورشاہ بن معظم شاہ الکشمیری الہندی،ثم الدیوبندیؒ،المتوفی ۱۳۵۳ھ)۔☆......العرف الشذی شرح سنن الترمذی (یہ بھی علامہ انورشاہ کشمیریؒ کی ہے)۔☆......قواعد فی علوم الحدیث (علامہ ظفر احمد العثمانی التھانویؒ، المتوفی ۱۳۹۴ھ)۔☆......معارف السنن شرح سنن الترمذی (علامہ محمد یوسف البنوریؒ، المتوفی ۱۳۹۶ھ)۔

مضمون کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں نکلتا ہے:

۱......امام ابوحنیفہؒ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے نامور محدث اور حافظِ حدیث تھے۔۲......امام صاحبؒ کے شیوخ اور تلامذہ کی کثرت آپؒ کے علوّ شان پر دلالت کرتی ہے۔ ۳......امام صاحبؒ پر جو بہتان ہے کہ آپؒ کے پاس احادیث نہیں تھیں،سراسر بے بنیاد دعوی ہے، بلکہ آپ مکثرینِ حدیث میں سے تھے۔۴......امام صاحبؒ کا حدیث پر عمل کرنے کا منہج یہ تھا کہ آپؒ صحیح حدیث اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری فعل کو لیتے تھے۔۵......امام بخاریؒ اور اصحابِ صحاحِ ستہ کے اکابر شیوخ امام صاحبؒ کے نامور تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ میں سے تھے۔۶......امام بخاریؒ کی اصح اور عالی اسناد والی روایات میں اکثر راوی حنفی تھے۔۷......امام بخاریؒ اور ائمہ صحاحِ ستہ احناف کی مرہونِ منّت ہیں۔۸......احناف نے فقہ کی ابتدائی خدمات کے ساتھ ساتھ علومِ حدیث کی ابتدائی خدمات بھی سرانجام دیں۔۹......احناف نے علومِ حدیث میں سے متون،شروحِ حدیث، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل الغرض تمام علوم میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔۱۰......احناف نے جہاں علمِ حدیث میں دیگر خدمات سرانجام دیں، وہاں علومِ حدیث میں تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔

☆......☆......☆

مصادر ومراجع:

(١) تذکرة الحفاظ، الطبقه الخامسه، الرقم: ١٦٣، ١/١٢٦، الطبعه الاولی: ١٤١٩ھ، دار الکتب العلمیه، بیروت لبنان. (٢) طبقات الحفاظ للسیوطی، الطبقه الخامسه، رقم الترجمه: ١٥٦، ص: ٨٠، ط: الطبعه الاولی: ١٤٠٢ھ، دار الکتب العلمیه بیروت. (٣) الثقات للعجلی، باب النضر والنعمان، رقم الترجمه: ١٨٥٣، ٢/٣١٤، ط: الطبعه الاولی: ١٤٠٥ھ، مکتبه الدار المدینه المنوره. (٤) تاریخ أسماء الثقات لابن شاهین، باب النون، رقم الترجمه: ١٤٧٧، ص: ٢٤١، ط: الطبعه الاولی: ١٤٠٤ھ، الدار السلفیه کویت. (٥) مناقب الامام الاعظم للموفق بن احمد المکی، واما مشایخ ابی حنیفه من التابعین...: ١/٣٨، ط: الطبعه الاولی: ١٣٢١ھ، مجلس دائرة المعارف حیدرآباد دکن. (٦) مناقب الامام ابی حنیفه وصاحبیه للذهبی، شیوخ ابی حنیفه، ص: ١٩، ط: الطبعه الثالثه: ١٤٠٨ھ، لجنه احیاء المعارف النعمانیه حیدرآباد دکن. (٧) مناقب الامام الاعظم للکردری، من روی عنه الحدیث والفقه شرقا وغربا بلدا بلدا: ٢٤٣-٢/٢١٨، ط: الطبعه الاولی: ١٣٢١ھ، مجلس دائرة المعارف حیدرآباد دکن. (٨) مناقب ابی حنیفه للموفق المکی، فضائل سیدنا ابی بکر الصدیق واتباع الإمام له: ١/٩٥، ط: الطبعه الاولی: ١٣٢١ھ، مجلس دائرة المعارف حیدرآباد دکن. (٩) مناقب ابی حنیفه للموفق المکی، فضائل سیدنا ابی بکر الصدیق واتّباع الإمام له: ١/٩٥، ط: الطبعه الاولی: ١٣٢١ھ، مجلس دائرة المعارف حیدرآباد دکن. (١٠) الانتقاء فی فضائل الائمه الثلاثه الفقهاء لابن عبد البر، باب جامع فی فضائل ابی حنیفه واخباره، ص: ٢٦٢، ط: المکتبه العاصمیه الغفوریه کراچی. (١١) الانتقاء لابن عبد البر، باب ذکر ما انتهی لینا من ثناء العلماء علی ابی حنیفه، ص: ١٩٩، ط: مکتبه العاصمیه الغفوریه کراچی۔ (١٢) لامع الدراری، مقدمه المؤلف، الفصل الثانی: فی الکتاب وفیه ایضا فوائد: ١/١٩٠، ط: مؤسسه الخلیل الاسلامیه، فیصل آباد پاکستان۔ (١٣) لامع الدراری، مقدمه المؤلف، الفصل الثانی: فی الکتاب وفیه ایضا فوائد: ١/١٩١، ط: مؤسسه الخلیل الاسلامیه، فیصل آباد پاکستان۔ (١٤) امام ابن ماجہ اور علم حدیث، جامع سفیان ثوری، ص: ٢٩٧، ط: سن اشاعت: ١٤٣٤ھ، مکتبہ البشری۔ (١٥) تاریخ بغداد، ذکر من اسمه محمد، ذکر وصف البصریین البخاری ومدحهم اياه، رقم الترجمه: ٣٧٤، ٢/٣٢٢، ط: الطبعه الاولی: ١٤٢٢ھ، دار الغرب الاسلامی بیروت۔ (١٦) الجواهر المضیه، فصل سنده فی الفقه، رقم الترجمه: ١٠٥، ١/٦٧، ط: میر محمد کتب خانہ کراچی۔ (١٧) الجواهر المضیه فی طبقات الحنفیه، مقدمه المؤلف، فصل (بلا عنوان): ١/٣٠، ط: میر محمد کتب خانہ کراچی۔ (١٨) الکفایه، باب فی أن المحدث المشهور...لایحتاج إلی تزکیة المعدل، ص: ٨٦، ٨٧، ط: المکتبه العلمیه، المدینه المنوره۔

تعلیم تربیت

علماءِ دین کی ذمہ داریاں اور عصر حاضر

مولانا محمد اسلام قاسمی

[مولانا محمد اسلام قاسمی صاحب (پ: ۱۶ فروری ۱۹۵۴ء) ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء دارالعلوم دیوبند کے مدرس اور دارالعلوم کے عربی مجلہ "الداعی" کے معاون مدیر رہے، ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم (وقف) دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو آپ کا بھی بحیثیتِ مدرس تقرر ہوا، آپ تا حال دارالعلوم (وقف) کے استاذِ حدیث وادبِ عربی اور اپنے آبائی وطن "جھارکھنڈ" کے کئی مدارس کے سرپرست ہیں، آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ادیب کامل اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان بھی پاس کیا، آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کی تحریریں ماہنامہ النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاء اللہ۔ ادارہ]

مشہور حدیث ہے "ان العلماء ورثة الانبیاء" کہ علمائے دین انبیائے کرام کے وارث ہیں، یہی حدیث بخاری شریف میں ان الفاظ کے ساتھ ہے **العلماء هم ورثة الإنبياء** کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔

جب لفظ وراثت کا ذکر ہوتو مطلب یہ ہوتا ہے کہ گزر جانے والے فرد کے مال ودولت کے حقدار اس کے وہ قریبی لوگ ہوتے ہیں جو نسبی تعلق رکھتے ہیں، مال وزر پانے والے حضرات وارثین ہوتے ہیں تو گویا انبیائے کرام کے وارثین چونکہ علماء ہیں، اس لیے ان کے حصے میں بھی ان انبیاء ورسل کے مال ہی آتے ہوں گے، اس لیے حدیث میں آگے اس کی وضاحت بھی آ گئی کہ یہ اللہ کے برگزیدہ بندے اپنی وراثت میں دینار ودرہم (مال وزر) نہیں چھوڑتے، جن کے وارث علماء ہوں گے، پھر یہ

اللہ کے نیک برگزیدہ بندے، اس کے پیامبر انبیائے کرام کیا چیز چھوڑ کے جاتے ہیں جس کے مستحق یہ علماء کرام ہیں؟

خود حدیث کے الفاظ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات دلالت کرتے ہیں کہ جو کارِ نبوت انبیاء کے ہیں اور جس مقصد کے لیے اللہ نے ان کو انسانیت کے لیے مبعوث فرمایا، اسی مقصد اور خدمت کو باقی رکھنے اور جاری رکھنے کی ذمہ داری ان منتخب افرادِ قوم پر عائد کی جارہی ہے جنہیں اللہ کی معرفت ہے، انبیاء کے ارشادات کا علم ہے اور ان کی شریعت کے جملہ احکام سے آگاہی ہے، یہی حضرات علمائے دین ہیں جو اس مشن کو لے کر چلیں گے اور اس کارِ نبوت کو انجام دیں گے، اسی بنا پر یہ انبیاء کے وارثین اور جانشین کہلائے۔ اس لیے علوم دینیہ کے طالبین کے لیے احادیث میں مختلف پیرایے میں بشارتیں، فضیلتیں اور ان کی خوبیوں وخصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**انما بعثت معلما**'' میں دنیا میں بحیثیت معلم بھیجا گیا ہوں اور یہ بھی ایک متفقہ حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء ورسل آئے ہیں، وہ معلّم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اہم ذمہ داری تعلیم دینا ہے، کس چیز کی تعلیم اور کن لوگوں کو تعلیم دینا، یہ بھی ایک ظاہر حقیقت ہے کہ بعثت نبوی کے کیا اغراض ومقاصد ہیں اور یہ کہ اللہ نے ہر زمانے میں اور ہر قوم میں اپنے برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے تو اس کا مقصد دنیا میں صلاح اور آخرت کی سعادت ہے۔ پوری انسانیت کی بھلائی، دنیا میں عدل وانصاف کی ترویج، بنی نوع آدم کی کامیابی اور فساد فی الارض سے اجتناب ہے۔ اس لیے انبیائے کرام کی بعثت کے بعد ان کی پہلی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خالق کائنات، رب العزت کی وحدانیت اور اس کی اطاعت کی دعوت دیں، پھر وہ پوری قوم کو ہدایت کی تعلیم دیتے ہیں، اللہ کے احکام کی اتباع، کامیاب دنیوی زندگی گزارنے کے طریقے اور آخرت کی تیاری کی ترغیب ہی دراصل کارِ نبوت ہے، انبیاء ان ہی باتوں کی ترغیب اور تعلیم دیتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے جو خالق کائنات ہے، اپنی کائنات میں اشرف المخلوقات یعنی بنی نوع انسان کے لیے ساری کائنات مسخر کردی، مگر اپنی قدرت اور عبادت کو تسلیم کرنے اور اس میں کسی کو شریک نہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ گویا ایمان لانے کے بعد پھر اپنی اطاعت کے لیے کچھ عبادتوں کو لازمی

قرار دیا، زندگی گزرانے کے کچھ رہنما اصول بتائے، فساد فی الارض سے منع کیا، کچھ حقوق واجب کئے، پورے معاشرے کی فلاح کے لیے احکامات دیئے اور بتادیا کہ ان احکام پر عمل اور منہیات سے رکنے کے بعد ہی اخروی زندگی کی سعادت حاصل ہوسکتی ہے اور جنت کا استحقاق بنتا ہے، یہی پیغام اور یہی ہدایت اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔

ہر قوم میں اللہ نے انبیاء اور رسول بھیجے اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ یہ بعثت خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر انتہا کو پہنچی، اللہ نے اپنی کتابِ مقدس میں واضح کر دیا کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا، یہی دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے اور خاتم الانبیاء نے بعثت کے بعد اپنی پوری زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کردی، اپنے قول وعمل سیرت وکردار اور اسوۂ حسنہ سے تمام دنیا کے لیے قابل تقلید اور واجب العمل دین وشریعت دے کر ایک نمونہ چھوڑا اور رخصت ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیض یافتہ صحابہ کرام کی جماعت نے قرآن وسنت اور رشد وہدایت کی توسیع و تبلیغ کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوا، پھر تابعین، محدثین، فقہاء، اولیاء اور علمائے عظام اس راہ پر چلتے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔

ہندوستان میں علمائے دین کا کردار: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد صحابۂ کرام کی جماعت نے اس کارِ نبوت کو جاری رکھا، پھر تابعین عظام اور ان کے بعد محدثین وفقہاء وعلمائے دین نے اس وراثتِ نبوی کو مستحکم کیا اور عام کیا، یہ زمانہ بنوامیہ کے بعد بنوعباسیہ خلافت کا تھا، مسلمانوں کی حکومت آباد دنیا کے بیشتر حصوں تک پہنچی تو اسلامی علوم وتہذیب اور قرآن وحدیث کے درس وتدریس میں وسعت آتی گئی اور جب ۶۵۶ھ میں بغداد کی مرکزی خلافت کا خاتمہ ہوا تو مسلمانوں کے زوال کا آغاز بھی ہوگیا، اندلس میں مسلم حکمرانی اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوچکی تھی، افریقہ کے ممالک میں مسلمانوں کی حکومت تھی مگر سب انتشار کا شکار یا زوال پذیر، برصغیر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم تھی مگر وہ اسلامی حکومت نہیں تھی، بدعات ورسومات یا حکمرانوں کے ذریعہ عام کیے گئے نظریات وعقائد ہی رائج تھے، بیشتر علماء دین یا تو حکمرانوں کے قریب ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دینی امور اور اسلامی علوم میں غلط تشریحات وتاویلات کا انبار لگا رہے تھے یا پھر ان میں قرآن وحدیث کی تدریس وتعلیم کا

جذبہ نہیں پایا جاتا تھا، اسلامی علوم کے نام پر فقہ، معقولات اور قدیم یونانی فلسفے میں مہارت حاصل کرنا ہی ان کے پیش نظر رہا، یا پھر گوشہ نشینی اپنانے کے لیے خانقاہوں کی پناہ میں چلے گئے۔ ایسے حالات میں مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسے حضرات کی خدمات ہی قابلِ ذکر کارنامے ہیں۔

پھر ایک انقلابی دور کا آغاز حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ان کے خانوادے اور ان کے فیض یافتہ افراد کے ذریعہ ہوتا ہے، جب حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے ہندوستان میں نہ صرف بدعات ختم کرنے کی کوشش کی بلکہ قرآن وحدیث، تفسیر واصول کے علوم کو زندہ کیا اور اسے دینی درسگاہوں میں تدریس کی بنیاد بنایا اور اسلامی علوم وفنون پر کتابوں کی تصنیف وترجمہ کا بیڑا اٹھایا اور یہ وہی وقت تھا جب ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کا اقتدار ڈولنے لگا تھا، بالآخر یہ عظیم ترین ملک بھی استعماری طاقتوں کے قبضے میں آ گیا، مگر ابھی علوم نبوی کے حاملین ووارثین اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوئے تھے، اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ حیدر آباد، بھوپال، لکھنؤ اور بعض دیگر علاقوں میں دینی وعلمی خدمات کا جذبہ رکھنے والے متمول گھرانے کی سرپرستی میں انفرادی طور پر علمائے دین اس وراثت نبوی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

مگر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی نے مسلمانوں کے دین وایمان اور دینی علوم کی حفاظت و اشاعت پر قدغن لگا دیا، حکومت گئی، آزادی سلب ہوئی، جان ومال کی قربانیاں دینی پڑیں اور دین وایمان کی بقاء واشاعتِ علومِ دینیہ کا مرحلہ سامنے آ گیا، ایسے میں علمائے کرام کی ایک جماعت نے جن کی تربیت قطب زمانہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں ہوئی تھی، ایک چھوٹے سے گاؤں ''دیوبند'' سے اس اہم ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے ''دینی عربی مدرسہ'' کی بنیاد ۱۸۶۶ء میں ڈال دی، اسی سال سہارن پور میں بھی ایک دینی مدرسے کی بنیاد پڑی، ڈیڑھ سو سال قبل قائم ہونے والے یہ ادارے اب ''دارالعلوم دیوبند'' اور ''مظاہر علوم سہارن پور'' کے نام سے موسوم ہیں۔ دیوبند میں قائم یہ مدرسہ دراصل ایک دینی اور علمی تحریک کا عنوان ہے جس کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان کے رفقاء علمائے دین اسلامی علوم کے ماہرین تھے، جنہوں نے ہر ہر میدان میں اپنی خدمات پیش کیں پھر ان ہی اصول ومقاصد کے تحت

ہندوستان بھر میں دینی مدارس قائم کئے جانے لگے اور وہاں سے فراغت اور علوم اسلامیہ کی تکمیل کے بعد فضلاء وعلماء کی جماعتوں نے ملک وبیرون ملک ہر علاقے میں تعلیم وتدریس، امامت وخطابت اور رشد وہدایت کے ذریعہ تعلیمی بیداری پیدا کی اور اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ بھی انجام دیا۔

بیسویں صدی میں علمائے دین کی خدمات: بیسویں صدی عیسوی میں خاص طور پر علمائے اسلام کی ذمہ داریاں اس لیے زیادہ ہوگئیں کہ اس زمانے میں دشمنانِ اسلام خاص طور پر یورپ نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف منصوبہ بند طریقے پر حملے تیز کئے، یہ وہ زمانہ ہے جب پوری دنیا میں خاص طور پر ایشیاء اور افریقہ براعظموں کے اسلامی ممالک برطانیہ یا فرانس کی استعماری طاقتوں کے ماتحت ہیں یا مقبوضہ ہیں، یورپ کی سیاسی، معاشرتی اور علمی ترقی کی تشہیر کی جارہی ہے اور دنیائے اسلام کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ آج کی سائنسی ترقی کا تقاضہ ہے کہ پرانی روایات اور فرسودہ فکر وخیال سے مکمل طور پر پیچھا چھڑا لیا جائے، حتی کہ دین وشریعت اور مذہبی عقائد کو بالائے طاق رکھ کر یورپ کی تقلید کی جائے۔

اسی کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور احکام شریعت میں اعتراضات واشکالات کے ساتھ مسلمانوں کو دین سے دور کرنے کی سعی کی جانے لگی، مسلکی نزاعات اور فروعی اختلافات کو ہوا دے کر مسلم قوم میں تفریق پیدا کی جانے لگی، ان کے فکر وخیال حتی کہ عقیدے کو کمزور کرنے کے لیے نت نئے فتنے ابھارے گئے، ان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کئے گئے تاکہ وہ اپنے عقیدوں یا احکام شریعت سے بدظن ہوجائیں یا کم ازکم احساس کمتری میں مبتلا رہیں اور اسلامی شریعت کی بجائے مغربی اور لادینی مذہب اپنالیں، مگر اس پرآشوب دور میں بھی علمائے دین نے اپنے فرائض اس طرح انجام دیئے کہ ان سازشوں اور فتنوں کے بالمقابل سینہ سپر ہوگئے اور ہر ہر جہت سے مسلمانوں کی دینی رہنمائی میں مشغول ہوگئے، گمراہ اور باطل فرقوں کی گمراہی اور بطلان کو واضح کرتے چلے گئے، اسلامی عقائد اور دینی تعلیمات کی سربلندی اور حقانیت قائم کرنے کے لیے ہر مورچے پر جمے رہے، کبھی مناظروں کی صورت میں، کبھی تالیف وتصنیف کے ذریعے، کہیں دعوت وتبلیغ کی راہ سے اور کہیں دینی مدارس قائم کرکے اور پورے ملک میں تقریر وتحریر کے واسطے سے، اسی طرح افتاء کے ذریعے مسلم

معاشرے کی دینی رہنمائی اور اصلاحِ معاشرہ کے نمایاں خدمات انجام دیتے رہے۔

ان دینی امور کی انجام دہی کے ساتھ جب ملک وملت کو استعماری قوتوں سے آزادی کے لیے جدوجہد کی ضرورت پڑی تو اس میدان میں بھی عملی وفکری قیادت پیش کی، نہ صرف جدوجہد آزادی کی ترغیب دی بلکہ خود بھی اس طرح کے معرکوں میں شریک رہے، معرکۂ شاملی اس کی ایک معمولی مثال تھی، بیسویں صدی میں جدوجہد آزادی کی تحریکات میں ان علماء کرام کی شمولیت اور جان ومال کی قربانیاں تاریخ آزادیٔ وطن کے صفحات میں نقشِ دوام کی صورت میں موجود ہیں۔

ملک آزاد ہوا تو پورے ملک کو اور خصوصاً امتِ مسلمہ کو بے شمار دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، معاشی طور پر بھی اور تعلیمی میدان میں بھی، دوسری جانب احکام شریعت اور اسلامی تعلیمات سے دوری بھی رہی، جس کے بظاہر اسباب معاشی بھی تھے اور دینی علوم سے بے رغبتی یا ناواقفیت بھی تھی، بہت سے علاقوں میں مسلمان صرف نام کی وجہ سے رہے، ورنہ ایمان وعقیدہ، دینی تعلیمات، احکام خدا اور رسول سے قطعی بیگانہ تھے، ایمان کے ظاہری علامات وعبادات رسوم وروایت کے درجے میں باقی تھے، ذہنی اور فکری طور پر خیر امت ہونے کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔ ایسے حالات میں بھی علمائے دین اور وارثین انبیاء اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے، ہر علاقے کے علماء مسلمانوں کی دستگیری اور دینی رہنمائی کی ذمہ داری نبھاتے رہے، بالخصوص علمائے دیوبند نے پورے ملک اور بیرون ملک میں اس طرح اپنی خدمات انجام دیں کہ امت کے بڑے طبقے کو ان سے خیر کی امیدیں نظر آنے لگیں اور دینی وملی امور میں دیوبند کے فیصلوں اور علمائے دیوبند کو مقبولیت وسند حاصل ہوگئی، علمائے دیوبند نے قرآن وحدیث ودیگر دینی علوم کی تدریس کے لیے مدارس قائم کردیئے جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور دعوت وتبلیغ اور تقریر وتحریر کے ذریعہ تفہیم شریعت اور اصلاحِ معاشرہ کے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ بدعات اور گمراہیوں کے خاتمے کی مہم بھی اپنائی اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا کرنے کی ترغیب عملی طور پر بھی دیتے رہے۔

موجودہ وقت میں علماء کرام کی ذمہ داریاں: مسلمانوں کا ایک طبقہ احکام شریعت پر عمل کرنے

میں تساہل برتتا ہے، قرآن وحدیث پر ایمان کے دعوؤں کے باوجود عملی طور پر کوتاہ نظر آتا ہے، اسی طرح ایک بہت بڑا طبقہ قرآنی تعلیمات اور دینی امور سے ناواقفیت کی بنا پر دین وعقیدے سے دور ہوتا ہے، ظاہر ہے امتِ مسلمہ کے ایسے طبقے کی دینی رہنمائی اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کو عام کرنا علمائے دین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کیوں کہ کارِ نبوت کو جاری رکھنا بھی ان وارثین انبیاء کا فریضہ ہے۔

بیسویں صدی کے اخیر میں جہاں پوری دنیا میں کچھ انقلابات آئے ہیں، وہیں ذرائع ابلاغ نے بھی کرۂ ارض کے تمام گوشوں کو ایک دوسرے سے قریب کر کے رکھ دیا اور ہنوز یہ سلسلہ روبہ ترقی ہے، اسی دور میں عالم عرب اور عالم اسلام کے ساتھ دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں میں دینی بیداری بھی آئی، اب جب ہم اکیسویں صدی میں ہیں علمائے دین، مفتیانِ کرام، مؤرخین اسلام اور اہل علم وخطابت پر مزید یہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ دعوتِ دین کے ساتھ مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا صحیح طریقہ بھی اپنائیں اور مسلم معاشرے کی اصلاح وتفہیم شریعت پر پورا زور صرف کریں۔

مختصر طور پر علمائے دین کی ذمہ داریاں اس طرح انجام دی جاسکتی ہیں:

☆...... اسلامی تعلیمات کی افادیت واضح کرتے ہوئے قرآن وحدیث کے قوانین وتعلیمات کو پوری دنیائے انسانیت کے لیے فلاح وسعادت پر مشتمل، تمام پہلوؤں کو پیش کرنا۔ ☆......دعوت الی اللہ اور احکامِ شریعت پر عمل کی ترغیب میں قرآنی ہدایت کے مطابق "حکمت اور موعظۂ حسنہ" کو ملحوظ رکھنا۔ ☆......قرآن اور دینی علوم کی ترویج کے لیے شہر شہر، گاؤں گاؤں مکاتب اور اسلامی مدارس جاری کرنا۔ ☆...... تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ تربیتِ اخلاق پر زور دینا۔ ☆......حسبِ ضرورت ایسی عصری تعلیم گاہوں کا قیام جہاں ابتداء سے اسلامیات کا درس بھی ہو۔ ☆......منبر ومحراب سے علماء ائمہ کرام دینی مسائل بیان کریں۔ ☆...... ہر میدان میں مسلم معاشرے کی اصلاح کی کوششیں کریں۔ ☆......شریعت میں واضح منکرات سے مسلمانوں کو روکنے کے ساتھ رائج بدعات ورسومات سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

☆...... مدارس، مساجد، مجالس اور خانقاہوں کے ذریعے بھی اصلاحِ فکر وعمل کی جدوجہد کریں۔

☆......ایسے طریقوں یا منصوبوں سے احتراز جن سے عام مسلمانوں میں ناگواری یا بیزاری پیدا ہو۔

☆......☆......☆

گلہائے رنگارنگ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت، ایمانی عمل ہے

مولانا طارق علی عباسی

انسان کی فطرت میں محبت کا مادہ موجود ہے، ہونا بھی چاہیے اور ایک انسان کو اس فطری تقاضے کی بنا پر محبت کرنی بھی چاہیے، مگر پہلے یہ سمجھ لینا بہت ہی ضروری ہے کہ محبت ہے کیا؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور محبت کرنے کا اصل میں حقدار کون ہے؟ اس لیے سب سے پہلے یہ جانتے چلیں کہ محبت نام ہے چاہنے کا اور یہ چاہنا سراسر دل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ محبت وہ کشش ہوتی ہے جس میں دل کا میلان اور محبوب کی طرف کھچاؤ پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ کچھ یوں نکلتا ہے کہ انسان کی طبیعت میں ایسا شعور اور سلوک کا ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کی خاطر اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بیگانہ وار اپنی تمام تر صفات و عادات اور اطوار و رسومات کو چھوڑ چھاڑ کر محبوب کی صفات اختیار کر کے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔

اصولی لحاظ سے محبت کی دو قسمیں ہیں، عقلی اور طبعی۔ عقلی محبت معنویات اور غائب سے ہوتی ہے اور طبعی محبت محسوسات اور حاضر سے ہوتی ہے۔ مضبوط محبت عقلی محبت ہے مگر جیسا کہ طبیعت کے اقتضاء کی وجہ سے غلبہ عام طور پر طبعی محبت کا رہتا ہے، مگر حقیقت میں قوی اور مستحکم محبت عقلی ہی ہوتی ہے۔ اس کو آسان الفاظ میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مؤمن مسلمان کو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین سے جو محبت ہوتی ہے، وہ عقلی محبت ہوتی ہے اور اپنی آل اولاد اور مال و دولت اور دنیاوی اشیاء سے آدمی کو جو محبت ہوتی ہے، وہ طبعی محبت ہوتی ہے۔

عام حالات میں طبعی محبت اگرچہ غالب نظر آتی ہے مگر جب کوئی خاص موقعہ آتا ہے تو عقلی محبت

غالب آ جاتی ہے، جیسے کوئی بھی مؤمن کبھی بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے دین اور انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق گستاخی برداشت نہیں کر سکتا، یہ محبت عقلی کے قوی ہونے کی دلیل ہے۔اس بحث سے سمجھانا مقصود یہ ہے کہ مؤمن کو اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقلی محبت رکھنی چاہیے، جیسا کہ ہمارے اسلاف کی کتب سے بھی یہ واضح ہوتا ہے۔

ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناپائیدار اشیاء سے بھی محبت ہوسکتی ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ ہاں! مگر یہ حقیقی معنوں میں محبت نہیں ہوتی بلکہ یہ محبت کا تلبس ہوتا ہے جسے ہم عام الفاظ میں یوں بیان کریں کہ یہ محبت کے نام پر دھوکا ہوتا ہے، جب اس اندھی محبت کا غبار انسان کے دل ودماغ سے ہٹتا ہے تو تب اسے پتہ چلتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اُف کس قدر میں نے خود کو سراب کی دھن میں مگن رکھ کر اپنی قیمتی صلاحیتوں کو ضایع کر دیا، خیر دراصل بتانا یہ ہے کہ محبت اور قلبی لگاؤ کے سب سے زیادہ حق دار اللہ جل وعلا ہیں کیوں کہ وہ رب العالمین ہیں، سب کے اکیلے خالقِ حقیقی وہ ہی ہیں اور وہ ہر اعلیٰ صفت سے متصف ہیں جن کا کوئی شمار اور حد وحساب نہیں اور اس کے احسانات لامتناہی ہیں۔

اس کے بعد پھر مخلوقات میں سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ اس محبت کے حقدار ہمارے نبی، آقائے نامدار، سرورِ دو عالم، رحمتِ کل جہاں، فخر کائنات، ، خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت سیدنا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ایمان لانے کے بعد ایک مؤمن کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب معرفت نصیب ہوتی ہے تو وہ محسوساتی اور ذوقی طور پر جان لیتا ہے کہ محبت پر ابھارنے اور محبت کرنے کی جتنی صفات ہیں وہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ اُتم موجود ہیں اور دیگر کسی بھی مخلوق میں وہ صفات موجود نہیں اور نہ ہی ہوسکتی ہیں۔ حسن و جمال، شیفتگی و ملاحت، کاملیت وکمالیت، اخلاق اور کردار، صبر و استقامت کا کمال نمونہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں اور ان جیسی نہ جانے مزید کتنی ہی ان گنت وصفیں اور کمالات ہیں جن میں آپ کی ذاتِ اقدس سب سے اعلیٰ اور بلند تر ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مؤمن کے دل میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت ورفعت اور شان وشوکت کا خیال قرار پکڑے، کیوں کہ خدائے واحد لاشریک لہ کی معرفت اور اس کی

ساری ہی نعمتوں کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ آپ ہی کی ذاتِ مطہرہ ہے، آپ ہی ساری کائناتِ عالم کے لیے سائبانِ رحمت ہیں، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسانات انسانوں پر سب سے زائد ہیں، بایں وجہ آپ کا حق بھی انسان پر زیادہ ہے، اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ آپ کی رسالت ونبوت پر کامل اعتقاد رکھے، تمام احکامات میں آپ کی بھرپور اطاعت کرے اور آپ کی عظمت ومحبت کو دل میں جگہ دے اور آپ پر بکثرت درودوسلام پڑھنے کا معمول بنائے رکھے۔

مؤمن پر ایمانی فرض بنتا ہے کہ وہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو ہر قسم کی محبت اور کسی بھی محبوب کی چاہت یہاں تک کہ خود اپنے نفس پر ہمیشہ مقدم رکھے، ایک کلمہ گو جب ایمانی غور وفکر سے کام لے تو اسے معلوم ہو جائے اور اس کی عقل بھی اسے بتائے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ اور معطر محبت، انانیت کی سرشت پر غالب ہے اور یہ پاکیزہ محبت انانیت ونفسانیت کی سب ہی محبتوں کو مٹا کر اور فنا کر کے رکھ دیتی ہے۔

ایک مسلمان کی آبرو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے نام مبارک سے ہے، آپ کا مبارک نام بے حد مقدس اور تابناک ہے، آپ ہی مؤمن کی چاہتوں کا مرکز ہیں، آپ ہی کی محبتوں اور اطاعت کے طفیل مؤمن کا دل میں ایمان کا نور روشن ہوتا ہے، آپ ہی کے نام کی برکت سے رونقِ حیات کی شمع قائم ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فطرتِ الٰہی کے محافظ اور آپ کی ہر ایک حکمت تدبیروں والی عقل سے فائق اور برتر ہے، زمانے کی رونقوں کا منبع وسرچشمہ آپ ہی ہیں، تخلیق، تقدیر، ہدایت ان سب کا محور اور انتہا بھی آپ ہی کی ذاتِ مبارکہ ہے، بقول حضرت علامہ اقبال مرحوم: مارا مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بس (یعنی ہمارے لیے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کافی ہیں اور بس)۔

ایک مخلص مسلمان کی ہمیشہ بس یہی سوچ ہو کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی کا حصول کس طرح ہوگا اور کون سے وہ اعمال ہیں جن کو اپنا کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضا کو پایا سکتا ہے تو اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کامل نمونہ ہیں، آپ کی سنت اور سیرت کی پیروی میں کامیابی کی حتمی ضمانت ہے۔

حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے بخاری شریف میں **کتاب الایمان** کے تحت ایک باب باندھا ہے جس کو عنوان دیا ہے **"حب الرسول ﷺ من الایمان"** یعنی نبی ﷺ سے محبت ایمانی عمل ہے، امام بخاریؒ اس باب میں دو احادیث لائے ہیں، پہلی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

> "نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی ماں، باپ اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

دوسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں **والناس اجمعین** کے الفاظ زائد ہیں۔ یعنی کہ جب تک تمام لوگوں سے زیادہ آپ ﷺ سے محبت نہ ہو جائے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا، ان دو احادیث کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی محبت ہر چیز سے زیادہ ہو، خود اپنے نفس سے اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت ہو۔ آج ہم خود اپنے آپ میں ذرا جھانک کر دیکھیں کہ حضور ﷺ سے ہم کتنی محبت کرتے ہیں؟ اور ہم اپنی زندگی کے قدم قدم کا جائزہ لیں کہ نبی کریم ﷺ کی مبارک سنتوں کو ہم نے کہاں تک پورا کیا ہے یا کر رہے ہیں؟

لہٰذا اے میرے عقلمند مسلمان بھائی ہمارے اور آپ کے لیے ایسی وفا شعار مخلصانہ محبت سیکھنے کا بہترین نمونہ اور لازوال مثال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سوانح اور سیرت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کی محبت و اطاعت میں اپنا مال و متاع، دنیاوی عیش و عشرت اور اپنی جانیں اور اپنے خاندان قربان کر دیئے اور محبت کے جذبات کو عملی جامہ پہنا کر قیامت تک آنے والے پوری دنیا کے انسانوں کو بتا دیا کہ محبت صرف آرزوؤں اور رسمی عقیدتوں کا نام نہیں اور محبت محض نعرے بازی کا وقتی جنون نہیں جو چند لمحوں بعد رفو چکر ہو جائے بلکہ محبت ایک دوامی جذبہ ہے جو حقیقت کا روپ دھار کر، قربانیوں کے گھاٹ اتر کر ہمیشہ کے لیے نقشِ دوام بن جاتا ہے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سینکڑوں واقعات اس ایمانی محبت کے پڑھنے کے بعد ایمانی قلب وزبان یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ بغیر کسی اسْتثنیٰ کے ایسے مقدس لوگ آج تک نہ کسی آنکھ نے دیکھے ہیں اور نہ ان سے پہلے کسی آنکھ نے دیکھے تھے۔ **رضی اللہ عنہم اجمعین**

اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ثابت کرنے کے لیےضروری ہے کہ ہم، آپ سب مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتلائے ہوئے ارشادات واحکامات پر بصد فرحت اور احترام کے ساتھ دل وجان سے ہمیشہ عمل پیرا ہوں۔

قرآن وحدیث میں متعدد جگہ نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے کی تاکید آئی ہے اور اس کے علاوہ اوامر کو بجالانے اور منہیات سے بچنے میں کسی بھی قسم کی سستی، کم ہمتی اور عذر سے بچنے کا اہتمام کریں اور یہی پیغام اپنی زندگی کا اہم فریضہ جانتے ہوئے ہم اپنے گھروں میں، محلوں میں، مسجدوں میں، مدارس اور اسکول و کالجز میں، کام کاج میں، غرض اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے پیشِ نظر رکھیں، کیوں کہ یہی وہ ایک ضمانت ہے جو ہر دو عالم میں ایک مخلص مؤمن کے لیے سرخروئی کا سبب ہے۔

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

اللّٰھم صل علی حبیبہٖ علی قدر حسنہٖ و جمالہٖ

☆......☆......☆

علم و تحقیق

برطانوی راج اور دیسی تعلیم

ڈاکٹر شاہد صدیقی

[ڈاکٹر شاہد صدیقی ایک پاکستانی ماہر تعلیم، صحافی، محقق اور مصنف ہیں۔آپ نے پاکستان کے کئی بڑے تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات سرانجام دیں، آپ ۲۰۱۴ سے ۲۰۱۸ء تک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد کے وائس چانسلر رہے، آپ کے اردو اور انگریزی کالم ملک کے بڑے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں، مشہور کالم نگار سینیٹر عرفان صدیقی آپ کے بڑے بھائی ہیں۔آپ کئی کتب کے مصنف ہیں، آپ کی تحریریں ماہنامہ النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاء اللہ۔ادارہ]

معروف اطالوی ادیب انتونیو گرامچی اپنی کتاب دی پریزن نوٹ بکس (The Prison Notebooks) میں تسلط (Hegemony) کے تصور پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔اس کے مطابق تسلط پولیٹیکل سوسائٹی (Political Society) یا سول سوسائٹی (Civil Society) کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ پولیٹیکل سوسائٹی فوج، پولیس اور بیوروکریسی کے ذریعے طاقت کا استعمال کرتی ہے۔ دوسری طرف سول سوسائٹی سماجی اداروں (Social Institutions) کو استعمال کرتی ہے۔سول سوسائٹی میں تسلط تعلیم، زبان، ادب اور ثقافت وغیرہ کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، سیاسی معاشرہ (Political Society) جبر کا استعمال کرتا ہے جبکہ سول سوسائٹی ڈسکورس کا استعمال کرتی ہے جو گرامچی کے خیال میں طاقت اور جبر کے طریقے سے زیادہ

مؤثر ہے۔اس نقطہ نظر کے ذریعے، طاقتور گروہ دوسروں کے ذہن اور سوچ کے عمل کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔تعلیم Discursive paradigm کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

سامراج کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سامراجی طاقتوں نے تعلیم کو نوآبادیاتی قوموں کا کنٹرول سنبھالنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ کام انہوں نے دو طریقوں سے کیا، سب سے پہلے تو انہوں نے مقامی طرز زندگی، تعلیم، زبان اور ثقافت کو بدنام کیا اور پھر ان پر اپنا سامراجی تعلیمی نظام اور زبان مسلط کر کے تسلط کے عمل کو مکمل کیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں انتہائی بے دردی سے مقامی ترقی (Development) کو غیر ترقی (Undevelopment) میں تبدیل کیا اور پھر اس پر اپنی مرضی کی ڈویلپمنٹ کا ماڈل تھوپا۔ترقی کی اس دلیل کو برٹش انڈیا میں تعلیم کے دائرے میں بھی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ پری برٹش انڈیا میں ایک جامع تعلیمی نیٹ ورک تھا جو عوام کے لیے سستا اور قابل رسائی تھا۔ یہ تاثر تواتر سے پھیلایا گیا کہ ہندوستان برطانوی راج سے پہلے ایک غیر مہذب اور گنوار ملک تھا جہاں تہذیب سے عاری لوگ رہتے تھے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔مستند تحقیق کے مطابق ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی ایک مؤثر تعلیمی نظام رائج تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا تھا تو اس مقامی اور مؤثر تعلیمی نظام کا کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد ہندوستان میں مقامی تعلیمی نظام کے زوال کی کئی وجوہات ہیں۔سب سے بڑی وجہ نوآبادیات کی ثقافت، تعلیم اور زبان کے بارے میں سامراج کا منفی نقطۂ نظر تھا۔سامراجی طاقت کی برتری کی وجہ سے نوآبادیاتی علاقے 'نوآبادیات کے معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور ثقافتی طریقوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

دوسری وجہ مقامی تعلیم کے لیے انگریزوں کی سرپرستی کا فقدان تھا۔انگریزوں کی آمد سے پہلے یہ سرپرستی ریاستی سطح پر شاہی ریاستوں کی طرف سے فراہم کی جا رہی تھی لیکن الحاق کے بعد مقامی ریاستیں کمزور ہو گئیں اور مرکزی برطانوی سلطنت نے اس سرپرستی کو کم یا بند کر دیا۔

مقامی تعلیم کے زوال کی تیسری وجہ انگریزوں کا نیا تعلیمی نظام متعارف کرانا تھا۔ چونکہ یہ وہ تعلیمی نظام تھا جو حکمرانوں نے متعارف کرایا تھا، اس لیے لوگ دو واضح وجوہات کی بنا پر اسے ترجیح دینے لگے تھے: نوکری کا حصول اور معاشرے میں بہتر سماجی حیثیت۔

مقامی نظام تعلیم کے زوال کے پیچھے چوتھی وجہ برطانوی راج کا اصلاحاتی ایجنڈا تھا جس کی وجہ سے ایک نیا تعلیمی نظام متعارف ہوا جو محدود تھا اور بہت کم لوگوں تک اس کی رسائی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا مقامی تہذیب وتمدن سے کوئی واسطہ نہ تھا' لیکن مقامی نظام پر اس پر برتری کو حکومتی سطح پر یقینی بنایا گیا۔

مقامی نظام تعلیم کے زوال کی پانچویں وجہ ہنگامہ خیز وقت اور دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سکولوں میں طلبا کی تعداد میں واضح کمی واقع ہوئی۔ مثال کے طور پر لیٹنر (Leitner) نے اپنی تصنیف ہسٹری آف انڈیجنس ایجوکیشن ان دی پنجاب' (History of indigenous education in the Punjab) میں بتایا کہ ۱۸۵۷ء میں پنجاب میں طلبا کی تعداد ۳۳۰۰۰ تھی جو کہ ۱۸۸۰ء تک ۱۹۰۰۰ تک گر گئی۔

یوں دیسی تعلیم کے زوال کے نتیجے میں ہندوستان میں خواندگی کی شرح میں کمی آئی۔ ۱۹۳۱ء میں رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز میں اپنی تقریر میں گاندھی نے کہا تھا: ”آج ہندوستان پچاس یا سو سال پہلے کی نسبت زیادہ ناخواندہ ہے۔“ انہوں نے خواندگی میں اس کمی کی وجوہات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ”برطانوی انتظامیہ نے تعلیم اور دیگر معاملات جو کہ پہلے موجود تھے، کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مٹی کو نوچ لیا اور جڑ کو اسی طرح چھوڑ دیا اور یوں یہ خوب صورت درخت مر گیا۔“

مقامی تعلیم میں کمی کا ایک اور نتیجہ وہ عدم توازن تھا جو معاشرے میں پیدا کیا گیا تھا کیونکہ نیا' انگریزوں کا متعارف کردہ تعلیمی نظام کچھ علاقوں تک محدود تھا اور محدود لوگوں کی اس تک رسائی تھی۔ اس ساری صورت حال سے بچا جا سکتا تھا اگر برطانوی راج کے فیصلہ ساز مختلف طریقہ کار اختیار

کرتے۔ ایڈم نے اپنی رپورٹ میں برطانوی حکومت کوسفارش کی کہ موجودہ مقامی ادارے ہر قسم اور طبقے کے اعلیٰ ترین سے نچلے درجے کے لوگوں کے کردار کو بلند کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنے کے بہترین ذرائع تھے، اس طرح کے مقصد کے لیے وہ ادارے آسان، محفوظ، سب سے زیادہ مقبول، انتہائی اقتصادی اور مؤثر منصوبہ ہوگا جو مقامی ذہن کو محرک فراہم کرے جس کی اسے تعلیم کے موضوع پر ضرورت ہو اور جو مقامی باشندوں کی بہتری کے لیے کام کرے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام ذرائع کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح کے منصوبے منرو، ایلفنسٹن، تھامسن اور لیٹنر نے تجویز کیے تھے لیکن ان منصوبوں کو برطانوی سلطنت نے نظر انداز کر دیا اور مقامی تعلیم زوال پذیر رہی۔ نوراللہ اور نائیک نے اپنی کتاب ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ' میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

> "دیسی پرائمری سکول یا تو غیر دانش مندانہ منصوبہ بندی سے مارے گئے، یا انہیں جان بوجھ کر مقابلہ کر کے تباہ کیا گیا یا سراسر نظر انداز ہونے کی وجہ سے وہ خود بخود مر گئے۔"

مقامی نظام تعلیم نظر انداز کرنے کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان، جس کا تعلیمی نظام ۱۸ ویں صدی میں کچھ مغربی ممالک کے برابر تھا، طویل نوآبادیاتی دور کے بعد ان سے بہت پیچھے رہ گیا۔

ہندوستان کی اس تعلیمی پسماندگی' کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے بارے میں کئی آرا ہو سکتی ہیں لیکن معروف ماہر تعلیم لیٹنر نے اپنی کتاب میں اعتراف کیا کہ "پنجاب کی حقیقی تعلیم معذور اور تقریباً تباہ (destroyed) ہو چکی ہے۔ اس کی صحت مند نشوونما اور ترقی کے مواقع یا تو نظر انداز کیے گئے یا خراب ہو گئے۔ اور ہم اس کا الزام کچھ افراد پر نہیں دھر سکتے بلکہ ہمارا سرکاری نظام اس کا ذمہ دار ہے۔ یوں ہندوستان کے گلی کوچوں تک رسائی والے مقامی نظام کو تہ و بالا کر دیا گیا اور مقامی معیشت کی طرح مقامی تعلیم کو بھی ایسے دھچکے لگے کہ آزادی کے بعد بھی یہ اب تک مکمل طور پر جانبر نہیں ہو سکی ہے۔

☆......☆......☆

میرا مطالعہ

مطالعہ کی سرگزشت

مولانا اعجاز احمد اعظمی

[مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ جید عالم دین، شفیق اتالیق، کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ منجھے ہوئے ادیب، محبوب قلمکار اور دسیوں کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا عرفات احمد اعظمی نے "النخیل" کی خصوصی اشاعت "مطالعہ نمبر" کے لیے آپ کی تحریروں کی روشنی میں آپ کی مطالعاتی زندگی پر مشتمل مضمون مرتب کیا جو بوجوہ شاملِ اشاعت نہ ہوسکا، افادۂ عام کے لیے نذرِ قارئین ہے۔ ادارہ]

میں نے کب سے مطالعہ شروع کیا ہے، مجھے اچھی طرح یاد نہیں، میرے گھرانے میں مطالعہ کا کوئی ذوق نہیں تھا۔ معمولی پڑھے لکھے لوگ تھے، دادا مرحوم اردو کی صرف ایک کتاب بہشتی زیور پڑھا کرتے تھے، اس سے انھیں شغف تھا۔ والد محترم شاعر تھے، شاعری کے اثر سے کچھ ادبی رسالے اور اپنے دینی ذوق کی وجہ سے کچھ مذہبی پرچے منگایا کرتے تھے اور فرصت کے اوقات میں انھیں پڑھا کرتے تھے۔ مجھے جب اردو پڑھنے کی کچھ شدبد ہوئی اور مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میری عمر اس وقت کل سات سال کی رہی ہوگی۔ میری ولادت ۵ فروری ۱۹۵۱ء کی ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی وفات پر والد صاحب نے دوشعر کا ایک قطعہ کہہ کر اپنی بیاض میں لکھا تھا اور میں نے اسی وقت اس کو پڑھ لیا تھا۔ مولانا کی وفات ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی، اس وقت میں نے وہ دونوں اشعار بے تکلف پڑھ لیے تھے۔ بہرحال جب پڑھنے کی شدبد ہوئی تو میں نے اپنے اندر مطالعہ اور علم کی شدید پیاس محسوس کی۔ ہر لکھا ہوا کاغذ میں

اٹھا اٹھا کر پڑھتا، جب کوئی نیا رسالہ آجاتا تو والد صاحب کے ہاتھ تک بعد میں پہنچتا، پہلے میں ہی اسے دیکھ ڈالتا۔ سب کہاں سمجھ میں آتا، مگر اکثر حصہ سمجھ میں آجاتا۔ گاؤں کے مکتب میں بیٹھایا گیا۔ قاعدہ بغدادی اور قرآن شریف بہت جلد پڑھ لیا۔ گھر پر اردو کی جتنی کتابیں تھیں سب پڑھ ڈالیں، میری بڑی بہن بہشتی زیور پڑھتی تھی، وہ سبقاً سبقاً پڑھ رہی تھی اور میں دوسرے اوقات میں گھنٹوں اس کے مطالعہ میں غرق رہتا، بہت سے الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تو بہن سے پوچھتا، اس سے نہیں حل ہوتا تو والد صاحب سے پوچھتا۔ انھوں نے میرے بار بار کے پوچھنے سے تنگ آکر اردو کا چھوٹا سا لغت ''جامع اللغات'' خرید کر مجھے دیدیا۔ اب مجھے بہت آسانی ہوگئی، پوچھنا میرے اوپر گراں بھی تھا۔ لغت مل جانے کے بعد مشکل الفاظ کا معنی سمجھنا آسان ہوگیا۔ چند ماہ میں نے لغت کو اتنا استعمال کیا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے حفظ ہوگیا۔ اب لغت دیکھنے کی نوبت مجھے کم ہی آتی۔

گھر پر کتابوں کا جو مختصر سا ذخیرہ تھا، وہ ختم ہوگیا تو میں انھیں کو دہرا دہرا کر پڑھتا رہا، مکتب میں ایک لائبریری تھی، اس میں زیادہ تر تاریخی اور جاسوسی ناول کی کتابیں تھی، ناول بچوں کے لیے شجر ممنوعہ تھا۔ پھر وہ ایک استاد کی نگرانی میں تھی، ہم بچے تو ادھر رخ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میرے والد صاحب کے ایک گہرے دوست تھے حافظ محمد رفیع صاحب مرحوم ...... یہ ہمارے گاؤں سے متصل محلہ نیا پورہ کے رہنے والے تھے...... پڑھے لکھے تو معمولی تھے مگر ولید پور اور بھیرا کے مکتبوں کے لیے ضروری کتابوں کو مہیا کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ کچھ دوسری کتابیں بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹا سا تجارتی کتب خانہ بنا رکھا تھا اور اپنے دادا میانجی ضیاء اللہ علیہ الرحمۃ کے نام پر اس کا نام ''کتب خانہ ضیائیہ'' رکھا تھا۔ حافظ محمد رفیع صاحب کو کتابوں سے بہت دلچسپی تھی، ان کی گفتگو زیادہ تر کتابوں کے موضوع پر ہوا کرتی تھی، میں والد صاحب کے پاس بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سنا کرتا۔ ان کی گفتگو سے مجھے بہت سی کتابوں کی معلومات ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ ایک دن مکتب میں صبح تعلیم کے بعد چھٹی ہوئی تو میں ڈرتے ڈرتے ان کے گھر پہنچ گیا، وہ مکان کے اندر کرگہ پر کپڑا بن رہے تھے اور ان کا کتب خانہ باہر کی بیٹھک میں تھا۔ میں پہنچا تو وہ اٹھ

کر کتب خانہ میں آئے ۔میں نے ان سے اجازت چاہی کہ کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں، انھوں نے اجازت دی مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ یہ کتابیں بیچنے کی ہیں، نہ یہ مڑیں تڑیں نہ ان پر داغ دھبہ لگے، بہت احتیاط سے پڑھنا۔ یہ تاکید کر کے وہ اندر چلے گئے، میں دیر تک بچوں کے لیے جوان کے پاس کتابچے تھے انھیں پڑھتا رہا۔ دیر ہوئی تو یہ خوف ہوا کہ والد صاحب تلاش کریں گے، جانے کا ارادہ کرتا تھا مگر کتابوں کے حسن فراواں نے دامن دل کو پکڑ رکھا تھا لیکن خوف غالب آیا، تاہم شوق مطالعہ کی رعایت بھی ضروری تھی، میں نے حافظ صاحب سے دو تین کتابیں مانگیں کہ انھیں پڑھ کر کل واپس کردوں گا۔ انھوں نے اسی احتیاط کی تاکید کر کے مجھے دے دیں، گھر آیا تو معمولی سی ڈانٹ سنی، کھانا کھایا اور بستہ اٹھا کر مکتب کی جانب چل دیا۔ پھر یہ روزانہ کا قصہ ہوگیا، سارے بچے مکتب سے چھوٹتے تو کھیلتے ،ندی میں نہاتے ،میں چھوٹتا تو سیدھا کتب خانہ ضیائیہ جاتا ،ظہر تک وہیں کھڑا بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا۔ حافظ صاحب کبھی کبھی کھانا بھی کھلا دیتے ،تب تو ظہر کے بعد وہاں سے آتا اور جب آتا تو دوایک کتابیں ساتھ لاتا ۔ مجھے کھیلنے اور سیر وتفریح کا ذوق بالکل نہ تھا، ساتھی مجبور کرتے ،مذاق اڑاتے تو کبھی چلا بھی جاتا ،مگر میرا جی کتابوں میں اٹکا رہتا۔ جمعرات کو مدرسہ میں بعد نماز ظہر چھٹی رہتی، میں اس روز مغرب تک ان کے کتب خانہ میں پڑا رہتا، پڑھتا رہتا، دہراتا رہتا، پھر حافظ صاحب نے اپنے کتب خانہ کو وہیں منتقل کرلیا جہاں وہ کرگہ میں کپڑا بنا کرتے تھے، وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، میں گھنٹوں وہیں کھڑا پڑھتا رہتا۔

اس وقت تک میں نے کوئی ناول نہیں پڑھا تھا، بس چھوٹی چھوٹی کتابیں جو بچوں کے مناسب ہوتیں وہی ان کے یہاں زیادہ تر ہوتی تھیں، انھیں کو میں مکرر، سہ کرر پڑھتا رہتا، کبھی کچھ نئی کتابیں آجاتیں تو میری عید ہوجاتی۔ مجھے یاد ہے ایک روز میں پہنچا تو ایک چھوٹی سی کتاب ''ابر رحمت'' نام کی رکھی ہوئی تھی، بہت خوبصورت چھپی ہوئی ،عمدہ ٹائٹل، بہترین کاغذ، اس کے تین یا چار حصے تھے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی، دو حصے تو وہیں پڑھ ڈالے اور باقی گھر لیتا آیا۔ جماعت اسلامی والے بچوں کے لیے اس وقت تک کئی کتابیں لکھ چکے تھے، انھیں ایک ایک کر کے پڑھا تھا اور کئی بار

پڑھا تھا۔ ''ابر رحمت'' کے سب حصے میں نے اتنی مرتبہ پڑھے تھے کہ تقریباً پوری کتاب حفظ ہوگئی تھی، اب جب کہ ایک مدت گزر گئی ہے، اس کے بہت سے مضامین یاد ہیں۔

اسی دوران ایک روز، ان کے کتب خانہ میں مولانا صادق حسین سردھنوی کا ناول ''جوش اسلام'' دکھائی دیا۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو کھو گیا، ان کے حسن وعشق کا باب تو میری فہم سے بالاتر تھا، مگر تاریخی حصہ میں بہت دلچسپی ہوئی، اس دن دوپہر میں مکتب نہیں گیا، نہ کھانا کھایا، مغرب تک پوری کتاب پڑھ ڈالی، گھر آیا تو دادا مرحوم نے ایک زوردار گھونسے سے تواضع کی۔ یہ پہلا ناول تھا جو میں نے پڑھا۔ دوسرے دن جب پہنچا تو وہ ناول موجود نہ تھا، غالباً فروخت ہوگیا تھا یا حافظ صاحب نے اس لیے کہ دوبارہ ناول پڑھنے کا جرم نہ کروں، وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ چند ماہ میں کتب خانہ ضیائیہ کا ذخیرہ تو تمام ہوگیا، میں پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھتا رہتا تھا، قند مکرر کا لطف آتا تھا۔ اب مجھے نئے میدان کی تلاش تھی۔

جب درجہ چہارم میں آیا تو ہم لوگوں کی تعلیم ایک دوسرے استاذ ماسٹر شفیع احمد صاحب سے متعلق ہوگئی، کمرہ بدل گیا، استاذ بدل گئے۔ مدرسہ میں جو لائبریری تھی ''آزاد لائبریری'' اس کے انچارج وہی تھے، یہاں آئے تو کتابوں کی ایک نئی دینا نظر آئی، ماسٹر صاحب خود بھی ناولوں کے رسیا تھے اور لوگ بھی ان کے پاس کتابیں لینے اور واپس کرنے آیا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب درجے میں ہوتے تو واپس ہونے والی کتابیں وہیں درجے میں رکھ دیتے۔ میں ذکر کر چکا ہوں ناول کو ہاتھ لگانا بچوں کے لیے جرم تھا۔ میں انتظار میں رہتا کہ کب ماسٹر صاحب بیڑی پینے کے لیے باہر جائیں اور کب میں یہ جرم کروں۔ وہ کئی مرتبہ اٹھ کر باہر جایا کرتے اور میں اتنی دیر میں ناول کا خاصا حصہ پڑھ لیا کرتا تھا۔ میں یہ جرم کرتا اور اس جرم میں اکیلا ہوتا، کوئی میرا ساتھی نہ ہوتا۔ مجھے جب میرے رفقائے درس پریشان کرنا چاہتے یا میں ان کی کوئی فرمائش کبھی پوری نہ کرتا یا اپنی طبیعت کی تیزی کی وجہ سے ان سے کبھی لڑائی کر لیتا تو ان کے پاس مجھے شکست دینے کا یہ بہت آسان حربہ ہوتا کہ ''ہم ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کریں گے کہ یہ ناول پڑھتا ہے۔'' اس سے میں سہم جاتا، فوراً شکست

قبول کرلیتا۔ مجھے اس کا ڈر نہ ہوتا کہ ماسٹر صاحب ڈانٹیں گے، جھڑکیں گے، یہ خوف ہوتا کہ وہ یہاں کی تمام کتابیں اٹھا کر لائبریری میں منتقل کردیں گے اوراس میں قفل لگا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب لڑکے پڑھائی کے علاوہ اوقات میں کوئی کھیل فٹ بال، کبڈی وغیرہ کھیلنا چاہتے اور اصرار کرتے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں اور میں انکار کرتا، تو وہ یہی دھمکی دیتے کہ ماسٹر صاحب سے شکایت کردیں گے اور مجھے مجبوراً کھیل میں شریک ہونا پڑتا۔

اس طرح دوسال کے دوران میں نے چوری چھپے صادق حسین صاحب کے تمام ناول جو لائبریری میں تھے، پڑھ ڈالے۔ ان کے حسن وعشق کا باب میں نہیں پڑھتا تھا، پھر جب دوسری کوئی نئی کتاب نہ ملتی تو اسے بھی پڑھ لیتا، مگر اس سے دلچسپی نہ ہوئی۔ اس زمانے میں جاسوسی ناول کو ہاتھ لگانے کا موقع کبھی نہیں ملا، کیوں کہ وہ ہمیشہ دست بدست رہا کرتے تھے۔

درجہ چار اور پانچ میرے لیے تاریخی ناولوں کا دور تھا، اس درس گاہ میں ایک بڑی سی پٹنی تھی، ماسٹر صاحب کی عدم موجودگی میں میں اس پر چڑھ جاتا، وہاں آزادی سے پہلے کے پرانے رسالے "مولوی"، "نظام المشائخ"، "نگار"، "پیشوا" اور "حریت" بہت تھے، پھٹے پرانے، مڑے تڑے، نچے ہوئے، وہ دو ایک بوروں میں بندھے رکھے تھے، میں نے وہ بورے کھول ڈالے، جب جب موقع ملتا، ان میں غرق رہتا۔

ہمارا مکتب موسم کے اعتبار سے کبھی دس بجے، کبھی ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کے وقفہ کے لیے بند ہوتا۔ سب لڑکے چلے جاتے تو اس میں تالا بند ہوجاتا، مجھے ایک ترکیب سوجھی، ماسٹر صاحب چھٹی ہوتے ہی چل دیتے، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم سب کے بعد نکلتے اور وہی تالا بند کرتے اور چابی اپنے گھر لے جاتے۔ میں چھٹی ہونے کے بعد بیٹھا اپنے درجے میں پڑھتا رہتا اور ان کو دیکھتا، جب وہ اٹھتے تو میں بھی اٹھ جاتا مگر مجھے یہ اٹھنا بہت کھلتا تھا کہ یہی تو فرصت کا وقت تھا جو چاہتا پڑھتا۔ ایک دن ہمت کرکے بیٹھا رہ گیا، مولوی صاحب نے مجھے بیٹھا دیکھ کر کہا کہ مکتب بند کرکے کنجی گھر پر دے دینا۔ میری عید ہوگئی۔ اب روزانہ کا یہی معمول ہوگیا، وہ چلے جاتے اور میں اندر سے

مکتب کو بند کر کے کبھی پٹنی پر چڑھ جاتا اور کبھی ناولوں میں غرق ہو جاتا، گھر سے تلاشی آتی، کبھی ماسٹر صاحب نکل آتے، ان کا گھر مکتب سے بالکل قریب تھا اور مجھے بادل ناخواستہ جانا پڑتا۔ چھٹی کے بعد تو یہ ہوتا اور ظہر بعد مدرسہ کھلنے سے پہلے کا دستور یہ بنایا کہ اس کے کھلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے میں مولوی صاحب کے گھر جاتا، کنجی ایک مخصوص کھونٹی پر لٹکی ہوتی، مولوی صاحب اس وقت ظہر کی نماز کے لیے جاچکے ہوتے، میں گھر کی عورتوں سے کنجی مانگ کر لاتا اور مدرسہ کھول اپنے مطالعہ میں ڈوب جاتا، جب تک ماسٹر صاحب آتے، میں مطالعہ کا کافی فاصلہ طے کر چکا ہوتا۔ مجھے اس دوران کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوتا تو میں وہاں بھی کتابیں ڈھونڈتا رہتا اور کوئی کتاب مل جاتی تو جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہیں لیتا، قرار نہ آتا۔ یہ کتابیں زیادہ تر دینی موضوعات پر ہوتیں، کیوں کہ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولی تھیں، وہ دیندارانہ ماحول تھا تو کتابیں بھی ویسی ہی رہا کرتی تھیں۔ طبیعت میں دین کی محبت رچ بس گئی تھی تاہم میرے لیے موضوع کی کوئی قید نہ تھی۔ درجہ چار پانچ میں ہندی کی بھی کچھ شد بد ہوگئی تھی، اس لیے اب مطالعہ دونوں زبانوں میں ہونے لگا تھا۔ ہندی کے ہلکے پھلکے رسالے اور کتابچے خوب پڑھ لیتا تھا۔ میں ہر طرح کی کتابیں پڑھتا، اس سلسلے میں میرا رہنما کوئی نہ تھا، بس طبیعت کی موج تھی، بلکہ جنون تھا کہ ہر لکھی ہوئی چیز پڑھنی ہے۔

ایک دن اپنے ایک ساتھی کے گھر گیا، جمعرات کا دن تھا، وہاں قصہ حاتم طائی مل گیا، پھر جو اس میں ڈوبا تو سورج ڈوبنے کے بعد ہی نکلا، مگر کتاب پوری نہیں ہوئی، رات بھر اسی کو خواب میں دیکھتا رہا، صبح ہوتے ہی پھر پہنچا اور پوری کتاب پڑھ کر جمعہ پڑھنے گیا۔

میں ان دنوں کتابوں کی تلاش میں اپنے دوستوں کے گھروں میں جایا کرتا تھا، حاجی محمد صابر صاحب مرحوم کے پاس کتابیں تھیں مگر وہ بوڑھے بزرگ، ایک بچہ ان کے پاس کیسے جاتا؟ ان کے بھتیجے ابوبکر سے دوستی ہوئی، ان کے واسطے سے ان کے گھر پہنچا اور جو کچھ ملا اسے چاٹ ڈالا۔ کیا ملا، وہ بھی بتادوں، تفسیر حقانی کے کچھ اجزا، تجلی دیوبند کے بہت سے پرچے، سب کہاں سمجھ میں آتا، مگر

پڑھتا سب تھا۔اس کی وجہ سے اسی وقت میرے معلومات بہت وسیع ہوگئی تھی۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پڑھنے کا ایک عجیب موڑ آیا۔ غالباً دادا مرحوم نے فرمائش کی تھی یا والد صاحب نے از خود حافظ محمد رفیع صاحب کے ذریعہ سے بخاری شریف کا ترجمہ کراچی سے منگوایا، یہ ترجمہ تین جلدوں میں ہے، ترجمہ کرنے والے مرزا حیرت دہلوی ہیں، یہ تینوں حصے گھر میں آئے تو میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ اب کچھ دنوں تک مجھے اورکوئی کتاب ڈھونڈھنی نہیں پڑے گی۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس سے پہلے میں حدیث کے دوسرے مجموعے ''جنت کی کنجی''، ''دوزخ کا کھٹکا''، ''رسول کی باتیں''، ''خدا کی باتیں''، ''پردہ کی باتیں'' وغیرہ بار بار پڑھ چکا تھا، اب جو یہ ام الکتاب آئی تو خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔اس کے آجانے کے بعد مکتب کے علاوہ کہیں آنے جانے کا سلسلہ تقریباً بند ہوگیا۔مکتب سے آتے ہی اس کا مطالعہ شروع کردیتا۔ جس دن کتاب آئی دادا مرحوم نے دوسرے دن مکتب کی چھٹی کے بعد مجھے حکم دیا کہ وضو کرو، خود بھی وضو کیا، صاف ستھری چٹائی بچھائی، رحل پر بخاری شریف کا پہلا حصہ رکھا، ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے اور مجھے حکم دیا کہ پڑھو۔ میں نے پڑھنا شروع کیا، دیر تک پڑھتا رہا، پھر یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک تینوں حصوں کی قرأت مکمل نہیں ہوگئی اور اہتمام والتزام وہی ہوتا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا۔

غرض یہ کہ اس وقت مجھے پڑھنے کا جنون تھا، میرا بس چلتا تو میں مکتب بھی نہ جاتا، کیوں کہ مکتب میں کتابوں کی چال چیونٹی کی تھی، جو کتابیں میرے درس میں ہوتیں، میں انھیں چند ہی دنوں میں چاٹ ڈالتا۔ ریاضی میں کمزور تھا، کیوں کہ گنتی لکھنے سے مجھے مناسبت نہ تھی، میں صرف پڑھنے کو علم سمجھتا تھا، گنتی پڑھنے اور لکھنے کو زائد کام تصور کرتا تھا۔

غالباً پرائمری ہی کا دور تھا، درجہ پنجم میں رہا ہوں گا، استاذ محترم مولانا عبدالستار صاحب کے یہاں ''الفرقان'' کا ''شاہ ولی اللہ نمبر'' نظر آیا۔ میں مانگ کر گھر لایا، اس کے مضامین بہت معیاری تھے لیکن عادت کے مطابق ایک طرف سے پڑھنا شروع کیا، اس میں مولانا مودودی صاحب کا بھی ایک

مضمون تھا، اس نے مجھے بہت متأثر کیا۔ خوب سمجھ میں بھی آیا، مگر حضرت مہدی کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، وہ نہ اس وقت سمجھ سکا اور نہ اب تک وہ سمجھ میں آیا۔ حضرت مہدی کے سلسلے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ''علامات قیامت'' کے نام سے، اس سے پہلے پڑھ چکا تھا۔ مودودی صاحب نے اس کے خلاف دعویٰ پیش کیا تھا اور دلائل میں صرف ان کے قیاسات تھے، اس سے طبیعت کو بے اطمینانی ہوئی۔ دوسرے ان کے بعض جملے جو تصوف کے متعلق تھے، دل میں بہت چبھے تھے۔

اس میں مسعود عالم ندوی کا بھی مضمون پڑھ کر تکلیف ہوئی تھی، بعد میں جب مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' پڑھنے کا اتفاق ہوا تو مسعود عالم صاحب نے ہندوستانی علما کی شاہ ولی اللہ صاحب سے پہلے جو تصویر بنائی تھی اور اس سے جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی، اس کا اثر ختم ہوا اور احساس ہوا کہ ہلدی کی گانٹھ پا کر پنساری کی دکان سجانے والوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

اس دوران گھر کے اندر جو کتابیں اور رسائل میں نے پڑھے اور بار بار پڑھے، ان میں ایک ماہنامہ ''الحسن'' رام پور تھا۔ اس کے بارہ پندرہ شمارے گھر میں تھے، شاید اب بھی ہوں گے۔ یہ ایک ادبی ماہنامہ تھا۔

ہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مجھے اشعار سے نہ مناسبت تھی نہ دلچسپی! پہلے سمجھ میں بھی کم ہی آتے تھے، نثری مضامین پڑھتے وقت درمیان میں کوئی شعر آ جاتا تو اسے میں چھوڑ دیتا تھا۔ اب بھی جس مضمون یا کتاب میں موقع بے موقع اشعار کی بھرمار ہوتی ہے، اس کا پڑھنا میرے لیے مجاہدہ ہوتا ہے۔ میرے گھر پر حفیظ جالندھری کی کتاب شاہنامہ اسلام تھی۔ اس میں نظم کیے گئے تاریخی واقعات کی سندیں حاشیہ میں سیرت النبی وغیرہ کے حوالے سے پیش کی گئی تھیں، لمبے لمبے حاشیے تھے، جتنے مضامین نظم میں تھے، تقریباً وہ سبھی حاشیہ کی نثریں موجود تھے۔ میں شاہنامہ کی نظم کبھی پوری نہیں پڑھ سکا، البتہ اس کا حاشیہ بار بار پڑھا۔ اب بھی وہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اسی طرح اس وقت

مسدس حالی اور شکوہ جواب شکوہ کا چرچا خوب تھا، مسدس حالی کا جو نسخہ میں نے پڑھا، اس میں بھی حواشی تھے، وہ تو خوب پڑھے، مگر اصل کتاب نہیں پڑھ سکا۔ شکوہ جواب شکوہ اس وقت پڑھا جب میں ادیب کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

میرے مطالعہ کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی تھی نہ کسی خاص طریقہ کی، گاؤں کا رہنے والا، جسے نہ علماء کی صحبت نصیب اور نہ علم کے آداب معلوم اور نہ اس کے گھر میں تحصیل علم کے لوازم و آداب موجود، بس جب جی میں آیا، کتاب لے کر پڑھنے لگا، کھڑا ہو کر پڑھتا تو ایک ایک گھنٹہ گذر جاتا، بیٹھتا تو بیٹھا ہی رہ جاتا، لیٹ کر مطالعہ کرتا تو کرتا ہی چلا جاتا، کھانا کھاتا رہتا اور پڑھتا رہتا، میری بہنیں میرے ہاتھ سے کتاب چھین لیتیں اور میں بے بس ہو جاتا، کھیلنے اور گھومنے پھرنے کا شوق نہ تھا۔ ساتھیوں میں پڑ کر کبھی ادھر ادھر نکل جاتا، ورنہ زیادہ تر گھر میں ہی گھسا رہتا۔ عصر کے بعد بھی کتاب میں جٹا رہتا۔ زبان سے پڑھنے کی عادت نہ تھی، نگاہ سطروں پر دوڑتی رہتی اور معانی دل میں اترتے رہتے، میری بہنیں اعتراض کرتیں کہ تم پڑھتے نہیں ہو، پڑھنا زبان سے ہوتا ہے اور تمہارا منہ تک نہیں ہلتا۔ انھوں نے مجھے پابند کیا کہ میں باآواز بلند پڑھا کروں، عصر کے بعد وہ دونوں روٹی پکاتیں اور میں کوئی کتاب سناتا، مگر اس میں پڑھنے کی رفتار اور مقدار بہت ہلکی اور کم ہوتی۔ میں نے کہہ دیا کہ تم لوگ میرے پڑھنے کو مانو یا نہ مانو، میں زبان سے نہیں پڑھوں گا، پھر وہ توے پر روٹیاں سینکتیں اور میں کتاب سے آنکھ سینکتا۔ میرے والد منع کرتے کہ عصر کے بعد پڑھنے سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے، صحت کا خیال رکھو، مگر میرا جنون اس کا متحمل نہ تھا۔

میری والدہ نہیں تھیں، میری نانی بہت بوڑھی تھیں اور مجھ پر حد سے زیادہ مہربان و شفیق! تقریباً ہر روز میری حاضری ان کے یہاں ضروری تھی، کوئی دن ناغہ ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتیں۔ میں بیمار ہوتا تو لاٹھی ٹیکتی میرے گھر آجاتیں اور گھنٹوں سرہانے بیٹھی رہتیں۔ مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی، میرے پڑھنے کا جنون انھیں معلوم تھا، مگر جب انھیں محسوس ہوا کہ یہ اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر پڑھتا ہے تو سمجھانے لگیں کہ ''اتنا نہیں پڑھتے۔'' دو ایک مرتبہ انھوں نے سمجھایا تو میں نے ان کے

پاس جانا چھوڑ دیا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے حجاب سا ہو گیا، میں نے نانہال کا رخ کرنا ہی بند کر دیا، حالاں کہ میرا دل نہایت مضطرب رہتا، مگر کسی طرح ہمت نہ ہوتی کہ وہاں جاؤں۔ دو ماہ اسی حجاب اور اضطراب میں گزر گئے، میں پریشان ہو گیا، نانی خود گھر پر آتیں اور میں سنتے ہی بھاگ جاتا کہ پڑھنے سے منع کریں گی۔ بالآخر گرفتاری ہوئی، سامنا ہوا، انھوں نے پڑھنے سے منع نہیں کیا، البتہ گھر پر نہ آنے کی شکایت کی پھر حجاب اٹھ گیا۔ یہ دور میرے لیے سخت اضطراب کا تھا۔

ایک زمانے میں والد صاحب نے میرے اوپر پابندی عائد کی کہ ''جو پڑھتے ہو، شام کو مجھے سنایا کرو۔'' میرا حافظہ اچھا تھا، شام کو سب سنا دیا کرتا، دو تین روز میں والد صاحب خود گھبرا گئے۔ حکم دیا کہ ''اچھا جو پڑھتے ہو، اس کا خلاصہ روزانہ لکھ لیا کرو۔'' لیکن یہ کام مجھ سے بالکل نہیں ہو سکا۔ لکھنے سے کوئی مناسبت نہ تھی، لکھنے میں وقت لگتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جتنی دیر لکھوں گا، اتنی دیر میں میں بہت کچھ پڑھ لوں گا، اس لیے قلم کبھی ہاتھ میں نہیں لیا، بس پڑھی ہوئی باتیں دماغ میں اتارتا رہا۔ اگر اس وقت کچھ نوٹ تیار کرتا رہتا تو آج میرے پاس علم کا بڑا ذخیرہ ہوتا، مگر مجھے تو پڑھنے کی دھن تھی۔

میرے گھر میں ''ہمدرد صحت'' کے کچھ شمارے تھے، یہ رسالہ ہمدرد دواخانہ دہلی سے حکیم عبدالحمید صاحب کی ادارت میں کبھی نکلا کرتا تھا، اس میں طبی مضامین کے علاوہ دوسرے بھی کارآمد مضامین ہوا کرتے۔ اس میں ایک مضمون تھا کہ ''آپ مطالعہ کیسے کریں؟'' اس عنوان کے تحت مطالعہ کے بارے میں بہت سی مفید باتیں لکھی تھیں، میں نے اسے بہت غور سے پڑھا، اس میں ایک بات یہ بھی لکھی تھی کہ کتاب میں یا مضمون میں جو بات پسند آئے یا ضرورت کی ہو، اسے ایک کاپی پر نوٹ کر لینا چاہیے۔ یہ بات اچھی تو بہت لگی، مگر عمل کبھی نہیں ہوا۔ ایک بات اور لکھی تھی کہ کتاب کا جو پیراگراف زیادہ ضرورت کا ہو، اس پر پنسل سے ہلکا نشان لگا دو، جب پوری کتاب کا مطالعہ ہو جائے تو ان مقامات کو پھر پڑھو، مکرر، سہ کرر پڑھو، اس طرح وہ بات محفوظ ہو جائے گی۔ یہ مشورہ بھی بہت اچھا ہے، مگر مجھ سے اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ مطالعہ کی روانی میں کبھی اس کا دھیان ہی نہ رہا۔ رہا یہ کہ اسے مکرر پڑھا جائے تو کم کوئی کتاب ہوگی، جس کو میں نے ایک ہی بار پڑھا ہو، اکثر کتابوں کو بار بار پڑھا ہے۔

ذہن میں باقی رکھنے کے لیے تکرار مطالعہ شرط ہے، کسی چیز کو ایک بار پڑھ لینا ہرگز کافی نہیں ہے، بار بار پڑھنا چاہیے، تب بات ذہن نشین ہوگی۔ بار بار پڑھنے سے معانی کے ساتھ الفاظ پر بھی عبور حاصل ہوتا، ان کا محل استعمال معلوم ہوتا ہے، ان کے معانی کی باریکیاں کھلتی ہیں، اسلوب ملتا ہے اور ہر بار کوئی نہ کوئی نئی بات ملتی ہے۔

کتابوں کے پسندیدہ اقتباسات نوٹ کرنا، ضروری مضامین کی فہرست بنا لینا، ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے ہوں یا جن کا لکھنے کا ارادہ ہو۔ مجھے کبھی یہ تصور ہی نہیں آیا کہ مجھے کبھی قلم بھی پکڑنا ہوگا۔ درجات پرائمری تو بچپن کی بالکل بے شعوری کا دور تھا، اس وقت تو یہ حال تھا کہ بچے جس طرح بے دردی سے اناپ شناپ کھاتے چلے جاتے ہیں اور نتیجہ کی کوئی پروا نہیں کرتے، ویسے ہی میں صرف پڑھنا جانتا تھا۔ اس کے نتیجے میں مجھے کیا ہونا ہے، عالم بننا ہے، مصنف بننا ہے، مدرس بننا ہے، واعظ بننا ہے، اس کا دور ونزدیک کوئی واہمہ تک نہ تھا۔ بس پڑھو اور پڑھتے چلے جاؤ، پر عمل تھا، بعد میں جب کچھ شعوری طالب علمی کا دور آیا اور مطالعہ کا معیار بلند ہوا، اس میں پختگی آئی، تب بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ تقدیر الٰہی کبھی ہاتھوں میں قلم بھی تھمائے گی، بلکہ اب جب کہ بہت کچھ لکھنے لگا ہوں تب بھی مطالعہ کی وارفتگی میں تصنیف و تالیف سب بھول جاتا ہوں، مطالعہ کے وقت روح پر ایک بے خودی سی طاری ہوتی ہے اور طبیعت اس سے نتائج اخذ کرنے سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ تالیف و تصنیف کے لیے مجھے الگ سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ بس بکثرت مطالعہ کا یہ فائدہ ہے کہ مصادر و مآخذ معلوم ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں کچھ زیادہ کاوش کرنی نہیں پڑتی، کوئی مضمون مرتب کرنا ہوتا ہے تو اس کے تمام مواد اور متعلقات بیک وقت پیش نظر ہو جاتے ہیں، یہ کثرت مطالعہ ہی کی برکت ہے۔

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

اکبر الہ آبادی کے افکار: ایک تعارف

پروفیسر عظمت حیات

[عمدہ قلم کار اور بہترین مضمون نویس پروفیسر عظمت حیات صاحب گورنمنٹ کالج، پنڈی گھیپ، اٹک (پاکستان) میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ”چودھری افضل حق بحیثیت اردو نثر نگار“ کے موضوع پر آپ نے پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام کیا ہے۔ آپ کے مضامین النخیل کی زینت بنتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔ ادارہ]

دل ہی دیتا تھا یہ، وہ دین بھی کرتے تھے طلب
یہی باعث تھا کہ اکبؔر کی بتوں سے نہ نبھی

صدیوں تک حکومت میں رہنے کے بعد برِ عظیم کے مسلمان بالآخر اٹھارویں صدی کے آغاز میں زوال کا شکار ہوئے۔ باکمال اورنگ زیب کے بے ہنر رنگیلے جانشین نت نئے فتنوں کو نہ سنبھال سکے۔ اوّل اوّل تو شاہی مرکزیت صوبے داروں کی خودسری سے پارہ پارہ ہوئی پھر سات سمندر پار کے قزاق بھی تاجروں کے بھیس میں ساحلوں پر غارت گری کرنے لگے۔ پہلے پہل بنگال بہار کو غداروں کے بل پر روندا۔ پھر درباروں راجواڑوں کی بے ہمتی اور کوتاہ اندیشی سے شہ پاکر شیر ہوئے تو انیسویں صدی کے شروع میں شاہ عالم کو پالم تک پابند کر دیا۔

سوداگروں کے بھیس میں ان ستم گروں کی کھلی زیادتیوں پر عوام سینے میں غم غصّہ دبائے پھرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں کارتوس کے قضیّے پر کمپنی کے سپاہیوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ایسے میں عوامی جذبات بھی پھٹ پڑے۔ فوجی بغاوت نے جنگِ آزادی کی صورت اپنالی۔ مگر نہتا اور غیر منظم

ہجوم مسلح اور منظم فوج پر کب جیتا ہے جواب فتح مند ہوتا۔ برطانیہ نے بھی لاکھوں مربع میل پر محیط ایک آزاد ملک کی حکومت اوراس کے کروڑوں عوام کے مقابلے میں اپنی ہم نسل اٹھائی گیر کمپنی کا ساتھ دے کر سوالائزڈ civilized ہونے کا ثبوت دیا۔ یہ وسیع و عریض خطہ برطانوی تاج میں ٹنکا البتہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوا۔قتل و غارت، داروگیر، بے دخلی اور جلاوطنی، معطلی اور برخواستگی ان کا مقدر ٹھہرے۔ عہدے، جائیدادیں، پیشے حتیٰ کہ زبان، ادب، تہذیب، مذہب سبھی بہ یک جنبشِ ابرو بے حیثیت ہوئے۔

راندۂ دربار قوم کے سرکار بازار سے قدم یوں اکھڑے کہ کہیں ٹکنے نہ پائے۔ نوبت یہ ہوئی کہ یا تو تھک ہار کر، ہاتھ پیر توڑ کر آنکھیں موندے لیٹے بیٹھے 'آپ فنا، جہان فنا' کا وظیفہ جپنے لگے یا پھر مخالفوں کی مخالفتوں، سازشوں سے ڈرے سہمے اپنی ہی تاریخ تہذیب سے الجھنے لگے۔ عقل معطل ہوئی تو قومی شکست کی وجوہ بجائے مہارتوں کے زوال میں تلاش کرنے کے الزام تہذیب کے سر تھوپنے لگے۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں سید اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی نے پرورش پائی۔

ان حالات میں قوم کے خیر خواہ بھلا کیسے خاموش رہتے! علماء نے عقیدہ و مذہب کے دفاع میں تو سرسید احمد خان نے قوم کے عہدہ و رسوخ کے تحفظ میں مجاہدانہ مساعی دکھائیں۔ تہذیبی محاذ کے دفاع کے لیے اپنی تخلیقی و اظہاری قوتیں بروئے کار لانے کی سعادت اکبر کو ملی۔ اکبرؔ کو حق سے ایسا طاقت ور اسلوب ودیعت ہوا کہ لسان العصر کہلائے۔ عصری سماجی تغیر کے فہم اوراس کے انجام و عواقب کے شعور کو اپنی لفظ نشینی اور جملہ سازی کی صلاحیت سے مرکب کر کے شعر کیا، تخلیق کیا کہ 'من فرمودم وحی اورہ شد' کا حکم جاری ہوا۔ اُن کے طنزیہ اور ظریفانہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہوئے۔ اکبرؔ نے بگڑے ہوؤں کو بنانے کے لیے ہنسی و دل لگی کا اسلوب اپنایا ؎

بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں

اصلاحِ قوم کے لیے اکبری طنز و مزاح کے سوتے اس سماجی عدم تطابق سے پھوٹتے ہیں جو قدیم تہذیب کو کم مایہ جان کر اغیار کی بھونڈی اور بے مقصد نقالی سے پیدا ہو رہا تھا۔ یارانِ وطن یہ

باور کرنے لگے تھے کہ شاید کوٹ پتلون، بنگلہ سگار پہن برت کران کی ایسی کایا پلٹ ہوگی کہ وہ محکوم رعایا کے درجے سے نکل کر حاکم طبقے میں شمار ہونے لگیں گے۔اس طرح کے متعدد اشعار اسی خام خیالی کی صورت گری کرتے ہیں ؎

پارک میں ان کو دیا کرتا ہے اسپیچِ وفا

زاغ ہو جائے گا اک دن، آنریری عندلیب

جنگ کے میدان میں شکست کے بعد تہذیب کے عنوان پر پسپائی کو اکبرؔ بڑی حد تک رضا کارانہ اور خود اختیاری فعل سمجھ رہے تھے، جسے روکنا اس وجہ سے نہایت ضروری تھا کہ خدانخواستہ یہ عارضی جنگی شکست دائمی ہزیمت میں نہ بدل جائے۔ یہ درست ہے کہ اکبرؔ کے عہد میں مشرق کے پاس مغرب کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں دینے کے لیے کچھ نہ تھا، تاہم فرد کی سرخوشی کے لیے ہنوز اس کے دامن میں بے شمار روحانی تجربات موجود تھے۔مگر المیہ یہ تھا کہ اکبرؔ کے ہم وطن اپنی توانا تہذیب کو تو مغرب کے ضعف سے راضی خوشی بدل رہے تھے، البتہ اپنی بے ہنری کو مغرب کی ہنر مندی سے بدلنے کو آمادہ نہیں تھے:

عزم کر تقلیدِ مغرب کا، ہنر کے زور سے

لطف کیا جو لد لیے موٹر پر زر کے زور سے

مغربی تہذیب اہلِ مغرب کے سماجی تجربات کا حاصل تھی اور اس کے بھلے بُرے نتائج بھی ان کے اپنے معاشرے کے حساب سے تھے۔اکبرؔ ایک منطقی ذہن کے حامل مفکر تھے۔وہ مغرب کی فتح کو اس کی سائنسی، فنی یا حربی فتح مانتے تھے اور اس کا توڑ بھی اہلِ مغرب جیسے یا اس سے بہتر ہنر حاصل کرنے میں تھا۔

علی گڑھ اور اکبرؔ کا اختلاف بھی (جس کی بنیاد پر کئی ایک فاضل ناقدین نے اکبرؔ پر رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی فردِ جرم لگائی ہے) انھی اصولی بنیادوں پر تھا۔اکبرؔ سر سید کے خلوصِ نیت کے معترف تھے مگر وہ علی گڑھ کی کامیابیوں کو جزوی سمجھتے تھے اور اس کی تعلیم کو مغربی معاشرت کی درآمد کا

ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

گریجوایٹ بالعموم 'شوقِ لیلائے سول سروس میں پتلون کو لنگوٹی' کرتے نظر آتے اور اگر سو پچاس کو سو پچاس (معمولی تنخواہ) پر نوکری مل بھی جاتی تو قومی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی ممکن نہ تھی۔

عہدے جو سو پچاس کو اچھے ملے تو کیا
قائم نہ ہو گی قوم کبھی سو پچاس سے

اور اگر معمولی نوکری کے بجائے بظاہر کوئی اعلیٰ عہدہ بھی مل جاتا تو غیروں کے نظام میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ چھوٹی یا بڑی "کلرکی" ہی تھی جس سے ملنے والے فائدے فرد کی ذاتی حیثیت کو تو کچھ بڑھا دے سکتے تھے مگر قوم کے لیے کسی کارِ نمایاں کی امید عبث تھی۔

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

قوم کے باصلاحیت افراد صرف ایک کلرکی (یہاں اس وضاحت کی تو ضرورت نہیں کہ کلرکی اکبرؔ کے نزدیک انگریزی حکومت کے ماتحت ہر عہدے کی علامت ہے) کی امید پر خود کو ہلکان کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ عہدے دار بن کر راضی خوشی یا مجبوری سے بہ ہر حال انھیں ایک الگ ڈھانچے میں ڈھل کر قوم سے قطع تعلق کرنا پڑتا تھا۔

مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت! توبہ توبہ

اسی لیے اکبرؔ قوم کی اقتصادی بہتری اور حریتِ فکر کے لیے تجارت، صنعت، زراعت کو ترجیح دیتے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور، سیکھو!
اُٹھو تہذیب سیکھو! صنعتیں سیکھو!، ہنر سیکھو!

ایک اور الزام اکبؔر پر یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کی حد تک تو انگریزوں کے اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے مگر ملازمت انھی کی کرتے تھے۔ اکبری افکار کے مطالعے سے یہ الزام بھی بے اصل ثابت ہوتا ہے۔ اکبر انگریزی تہذیب کے مخالف تھے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، وہ انگریزی فنون یا ہنر کی تعلیم کے ہرگز مخالف نہ تھے۔ البتہ ایسی تعلیم جو مغربی معاشرت سے مرعوب کرنے اور نئی نسل کو بے ہنر بنا کر صرف اور صرف نوکر پیشہ ماتحت بنانے کا ایک بہانہ تھی، اس کے مخالف تھے۔ پھر ملازمت میں بھی وہ انتظامیہ کا کل پرزہ نہیں تھے بلکہ جج کے طور پر کام کرتے رہے ؎

حاصل کرو علم، طبع تیز کرو
باتیں جو بری ہوں، ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبؔر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

اکبؔر پر ایک اور الزام یہ ہے کہ انھیں دورِ جدید کی ہر ایجاد سے خوامخواہ کی چڑ تھی۔ مثلاً ؎

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

یا

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا مُنہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جا کر

سرسری جائزے سے تو یہ الزام جان دار لگتا ہے کہ آخر ٹائپ کے حرف یا پائپ کے پانی میں کیا خرابی ہے یا ہوٹل کی رہائش اور ہسپتال کی مرگ میں ایسی کیا قباحت ہے کہ اکبؔر اس پر دہائی دے رہے ہیں۔ مگر اسلامی تہذیب کے تناظر میں دیکھیے تو اکبؔر کی صدا بے محل نہیں لگتی۔ اکبؔر کا تعلق اس قوم سے تھا جس میں فنِ خطاطی کو تعلیم کا حصّہ بلکہ لازمۂ شرافت سمجھا جاتا تھا اور جس نے دستاویزات و مسودات

سے لے کر الواح و عمارات تک اور مساجد و مقابر سے لے کر منبر و محراب تک، ہر ایک مقام پر اپنے کمالِ تحریر سے ندرت طرازی کی مہر لگا دی تھی۔ خطاطی کے فن کو بے مثال ترقی دینے والی اس قوم کا سابقہ جب ٹائپ کے بے جان حروف (یاد رہے اس عہد میں اُردو ٹائپ بھی ابھی بڑی خام سی حالت میں تھا) سے پڑا تو آنکھ آنا اچھنبے کی بات نہیں تھی۔ یہ احتجاج ایک فطری عمل تھا۔ بعینہ پائپ کے پانی، جس کا منبع بیشتر صورتوں میں ٹینک کا ذخیرہ ہوتا تھا نہ کہ کوئی تازہ ابلتا، آبِ حیات کا چشمہ اور جس کا پائپ بھی علی العموم بہت دفعہ موریوں نالیوں سے پار ہوتا تھا، پر اکبرؔ جیسے حساس کا احتجاج نہ کرنا طہارت و نظافت کے خاص تصورات رکھنے والی قوم کے لیے دیکھتی آنکھوں مکھی نگلنے والی بات تھی۔

کیا آج پائپ کا پانی کوئی رغبت سے پیتا ہے اور اگر پیے تو پیٹ چلنا کیا ناممکن ہے؟

گھر مشرقی تہذیب کا آشیانہ تھا جہاں صرف ایک خاندان کے مل بیٹھ کر کھانے رہنے کا سامان ہی نہیں تھا بلکہ یہ فرد کو رشتہ برادری، اڑوس پڑوس کے ناتے میں پرو کر معاشرے کا ذمہ دار رکن بنانے والا ادارہ بھی تھا۔ ہوٹل کا تجربہ گھر کے برعکس فرد کو زیادہ خود مرتکز اور بے مروّت بنا رہا تھا جہاں وہ اپنے پرائے کی ضرورت محسوس کیے بنا، سر نیچا کیے صرف اپنا پیٹ بھرنے کی فکر کرنے لگا تھا۔

کتنے ہی قریب المرگ مریض آج بھی ہسپتال میں بیگانوں میں یگانہ بن کر سسکنے کے بجائے اپنی آخری سانسیں آشنا چہروں اور مانوس در و دیوار کے درمیان لینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے کنبے اور گھر کو آخری بار جی بھر کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ موت کی سختی اور صداقت دلوں پر اثر کرتی ہے تو بسا اوقات زندوں کو بندگی کا قرینہ اور مرنے والے کو نجات کا ذریعہ مل جاتا ہے۔ اکبرؔ کے زمانے میں تو گھر سے باہر مرگ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ان حقائق کو سامنے رکھ کر مان لینا چاہیے کہ اکبرؔ کا یہ روّیہ خاص معاشرتی اداروں اور نصیحت پذیری کے خاص لمحوں کی گم شدگی کی وجہ سے تھا نہ کہ خواہ مخواہ کی چڑ۔

اکبرؔ کی بیشتر تعلیمات پر عمل در آمد آج بھی کار آمد ہے۔ مثلاً۔ جدید تعلیم ضروری ہے۔ ع کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ۔ البتہ ملت کے معنی اور مقصد سے غافل نہیں ہونا چاہیے ؎

بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو راہزن پیدا

۲۔تعلیم ایسی با مقصد ہونی چاہیے کہ بجائے نوکری کی امید کے نوجوان کسی ہنر کے قابل ہوں ۔

کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ

اگر صنعت، زراعت یا دیگر ہنر میں ترقی نہ ہو تو ایسا ملک دوسری قوموں کے لیے صرف ایک منڈی ہوگا۔

۳۔قومیں تجارت اور کاروبار سے عروج پاتی ہیں نہ کہ غیروں کے طرزِ معاشرت کی پیروی سے۔ اگر اپنی تجارت اور اپنا کاروبار نہیں ہوگا تو ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ محض غیروں کے مالِ تجارت کا حساب کتاب رکھنے والا منشی بن سکے گا ۔

ہے تجارت واقعی اک سلطنت زور یورپ کو اسی سے آج ہے

اکبؔر پر اہلِ علم نے تحقیقی، تنقیدی، توضیحی کتابیں لکھی ہیں اور شاید آئندہ بھی لکھی جائیں مگر شاید ہی دُور رس اکبری فکر کے تمام پہلو کسی ایک ذہن میں سما سکیں ۔

مرا ہر شعر اکبؔر ایک دفتر ہے معانی کا کوئی سمجھے نہ سمجھے، ہم تو سب کچھ کہہ گزرتے ہیں

البتہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے بزرگ اکبر شناسوں اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد جیسے متحرک محبّینِ اکبر سے التماس ہے کہ اکبؔر کے کلام کے منتخب حصّے طلبہ اور عام قارئین کی فکری راہنمائی کے لیے مرتب کریں تاکہ نئی نسل یہ جان سکے کہ جب تہذیب کا دھارا موڑ کر، روایت کی کھیتیاں اجاڑ کر، جدت کے گُل کھلائے جا رہے تھے تو ایسے میں ایک مردِ خدا اکبؔر نامی تھا جو خوب کی بے قدری اور ناخوب کی پذیرائی کا تماشا دیکھ بھی رہا تھا اور اس کے انجامِ بد سے اپنے خاص اسلوبِ شعر میں قوم کو بروقت خبردار بھی کر رہا تھا۔

سو سال پہلے ۱۹۲۱ء میں اکبؔر الہ آبادی کی جسمانی موت واقع ہو گئی مگر ان کی فکر کو علامہ محمد اقبالؔ کا شعری قالب عنایت ہوا اور اقبالؔ کے بعد یہ تعلیمات اہلِ حق کے قلب میں کندہ و تازہ ہیں ۔

دل ہی دیتا تھا یہ، وہ دین بھی کرتے تھے طلب یہی باعث تھا کہ اکبؔر کی بتوں سے نہ نبھی

☆......☆......☆

کتب نما

مطالعہ کا ڈھنگ

محمد عامر ہاشم خاکوانی

[محمد عامر خاکوانی صحافی، کالم نکار اور ادیب ہیں، آپ روزنامہ ۹۲ نیوز کے میگزین ایڈیٹر اور "زنگار" کے نام سے کالم لکھتے ہیں، ان کالموں کے کئی مجموعے اسی نام سے ہی شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے مضامین النخیل میں شائع ہوتے رہیں گے۔ ادارہ]

یہ پچھلے سال کی بات ہے، ایک صاحب (نائب مدیر ماہنامہ النخیل) نے واٹس ایپ پر رابطہ کیا اور اپنے جریدے ماہانہ النخیل کے لیے مطالعہ کی عادت، اسلوب وغیرہ کے حوالے سے ایک تحریر دینے کا کہا۔ ساتھ ایک سوالنامہ بھی تھا۔ ایک دو بار یاددہانی بھی کرائی گئی۔ ان دنوں کچھ نجی اور پیشہ ورانہ امور میں مصروفیت بہت زیادہ تھی، وقت نہ نکال سکا۔ یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کتنے بڑے پیمانے پر یہ کام کیا جا رہا ہے۔

دینی، علمی جریدے النخیل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی ابن الحسن عباسی صاحب کی شخصیت اور ان کے کام سے واقفیت تھی، جو اس کے مدیر تھے۔ بعد میں عباسی صاحب کی مطالعہ پر ایک کتاب پڑھی اور بہت متاثر ہوا۔ خیر ایک دو بار کوشش بھی کی کہ کچھ پرانی اور کچھ نئی یادیں اکٹھی کر کے مضمون بھیج دوں، مگر ہو نہ سکا۔ کچھ عرصے بعد النخیل کا یہ نمبر منظر عام پر آیا تو پتہ چلا کہ کیسا شاندار اور وقیع کام ہوا ہے۔ یہ خاص نمبر اب ساڑھے سات سو صفحات کی کتاب کی شکل میں بعنوان "یادگارِ زمانہ شخصیات کا احوالِ مطالعہ" شائع ہو چکا ہے۔ اسے بدقسمتی کہیں کہ اس پراجیکٹ کے بانی اور نگران ابن الحسن عباسی صاحب اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

اگلے روز اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے احساس ہوا کہ بہت کچھ ایسا ہے جسے قارئین

کے ساتھ شیئر کیا جاسکتا ہے۔مختلف اہل علم سے پانچ سوال پوچھے گئے تھے: ذوق مطالعہ کیسے پیدا ہوا اور اس کی نشوونما کس طرح ہوئی۔کون سی شخصیات ہیں جنہوں نے ذوق مطالعہ کو مہمیز کیا، مطالعہ کے مختلف ادوار کیا رہے، پسندیدہ موضوعات وغیرہ۔ پسندیدہ مصنّفین، پسندیدہ کتابیں، رسالے، افسانہ نگار، کالم نگار، مزاح نگار۔مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں، رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے، دورانِ سفر مطالعہ وغیرہ۔ نئے قارئین کے لیے مطالعہ کا کیا طریقہ کار ہو، کتابیں کیسے چنی جائیں، کسی کی رہنمائی میں مطالعہ کیا جائے یا اپنے ذوق کے اعتبار سے؟''

مطالعہ نمبر کے لیے بنیادی طور پر دینی طبقے سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کا انتخاب کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے دینی مدارس سے وابستہ بہت سے بڑے بڑے ناموں سے رابطہ کیا گیا، بعض اہم یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان نے بھی کنٹری بیوٹ کیا، جبکہ جناب مجیب الرحمن شامی، عطاالحق قاسمی، سعود عثمانی سے لے کر اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز بھی اپنی تحریر بھجوانے والوں میں شامل ہیں۔

مجھے ہمیشہ سے یہ لگتا ہے کہ ہمارے جیسے صحافیوں اور کالج، یونیورسٹی کے اساتذہ یا جدید تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل افراد کے سوچنے، سمجھنے کا اسلوب دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے بہت مختلف ہے۔وجہ شائد یہی کہ دونوں کی دنیا الگ ہے، ایک دوسرے سے کٹی ہوئی، یکسر جدا۔جدید تعلیمی ادارے جنہیں دینی طبقہ عصری ادارے کہتا ہے، یہاں کے لوگ اور دینی مدارس سے منسلک احباب اپنی اپنی دنیا میں اپنے انداز سے سانس لیتے ہیں۔ایک دوسرے کو سمجھنے کا ایک واسطہ سوشل میڈیا نے پیدا کیا ہے، مگر دینی اساتذہ اور ٹھیٹھ مذہبی سوچ رکھنے والا طبقہ سوشل میڈیا کے گند کی وجہ سے دور ہے۔ النخیل کا یہ خصوصی مطالعہ نمبر یا یہ کتاب ''یادگارِ زمانہ شخصیات کا احوالِ مطالعہ'' دینی طبقہ کو سمجھنے کا بڑا اچھا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔جب کسی کے سوچنے، سمجھنے، فکر کا انداز اور اس کی علمی بنیاد سمجھ آجائے تب آپس میں مکالمہ آسان ہوجاتا ہے اور مشترک نکات ڈھونڈنے بھی مشکل نہیں رہتے۔یہ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے بہت سے دلچسپ نکات اور ٹکڑے ملے، ان میں سے چند ایک شیئر کرنا چاہتا ہوں۔

مراد آباد، بھارت کے مفتی شبیر احمد قاسمی نے اپنے مطالعہ کی تفصیل اور دیگر جوابات دیتے ہوئے

ایک جگہ امام علاؤالدین علی بن ابراہیم البغدادی کی تفسیر کی ایک عبارت پیش کی ہے:

''کسی عالم کے اندر رسوخ فی العلم پیدا ہونے کے لیے چار باتیں لازم ہیں، یہ ایک عالم دین کے لیے بہترین علامتیں اور نشانیاں ہیں۔ التقوی فیما بینہ و بین اللہ تعالیٰ: اللہ اور اس کے درمیان تقویٰ کا معاملہ ہو کہ ہر معاملہ میں ورع و تقویٰ اور پرہیز گاری کا راستہ اختیار کرتا ہو اور خوف خدا کا غلبہ ہو۔ التواضع فیما بینہ و بین الناس: اپنے اور لوگوں کے درمیان تواضع اور عاجزی وانکساری کا معاملہ رہے۔ و الزھد فیما بینہ و بین الدنیا: اپنی اور دنیا کی دولت کے درمیان زہد کا راستہ اختیار کرنا۔ و المجاھدۃ فیما بینہ و بین النفس: اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کا معاملہ کرنا، جو نفس چاہے اس کی مخالفت کرنا اور نفس کے خلاف مرضی مولیٰ پر عمل کرنا۔''

ایران سے مولانا قاسم قاسمی نے اپنے جواب میں لکھا کہ: نئے مطالعہ کرنے والوں کو رہنما کی سخت ضرورت ہے، تاہم رہنمائی کرنے والے کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھے کہ مطالعہ کرنے والا کون ہے، کہاں رہتا ہے اس کی ضروریات کیا ہیں وغیرہ۔ انھوں نے ایک اور دلچسپ تجویز پیش کی جو سٹڈی سرکل سے ملتی جلتی ہے، لکھتے ہیں:

''ایک بات جو بہت مفید ہے کہ کبھی اہل مطالعہ کسی خاص جگہ اکٹھے ہو کر اپنے حاصل مطالعہ زبانی پیش کریں، ہفتہ یا مہینہ میں ایک دن معین کر کے کچھ اہل ذوق لوگ اکٹھے ہوں اور اپنے مطالعہ کا نتیجہ بتائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی انجمن بنائی جائے۔''

ہریانہ، بھارت سے مولانا کلیم صدیقی نے اپنا تجربہ شیئر کیا کہ ہریانہ میں میرے شیخ نے دعوتی کوشش کے لیے بھیجا، وہاں مایوس ہو گیا تھا، ایک روز مسجد میں بیٹھ کر ملفوظات رائے پوری دیکھی، اس میں پہلا ملفوظ تھا ''ارادت کا مزا فٹ بال بننے میں ہے۔'' ان مولانا صاحب کو اس سے خیال آیا کہ یہی کیا جائے اور اپنے مرشد بزرگ کی ہدایات پر مکمل عمل کیا جائے، اس سے بعد میں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اثنائے سلوک میں انہیں مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، مکتوبات صدی، دوصدی از شیخ شرف الدین یحیٰ منیری، مکتوبات خواجہ معصوم اور شاہ ولی اللہ کی کتابیں پڑھنے کا کہا گیا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا مشورہ تھا: ''مطالعہ میں تسلسل ہونا چاہیے، روز اس کے لیے کچھ

وقت متعین ہو، مطالعہ جس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری نہیں اسے مطالعہ کا کوئی محرک ڈھونڈنا چاہیے جیسے کسی موضوع پر لکھنا، خطاب، مذاکرہ میں حصہ، درس وغیرہ۔"

مولانا سراج الدین ندوی کا مشورہ دلچسپ تھا، لکھتے ہیں:

"اگر پورے دن کا شیڈول ترتیب دیں تو آسانی سے چار پانچ گھنٹے مطالعہ کے لیے نکالے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر حصول رزق کے لیے آٹھ گھنٹے، آرام کے لیے چھ گھنٹے، اہل خانہ کے لیے دو گھنٹے، نمازوں کے لیے دو گھنٹے، کھیل کود اور ورزش کے لیے ایک گھنٹہ، ناشتہ اور کھانے کے لیے ایک گھنٹہ جبکہ مطالعہ کے لیے چار گھنٹے۔ ہفتہ میں ایک دن شیڈول کی چھٹی ہو جس میں ذاتی ضروریات، احباب اور اہل خانہ کے لیے اوقات فارغ رہیں۔"

انہوں نے مولانا آزاد کا حوالہ بھی دیا کہ کئی بار مہاتما گاندھی ان سے ملنے گئے تو مولانا نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ میں اس وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوں، میرا یہ وقت صرف اسی کام کے لیے ہے۔

کراچی کے معروف عالم مولانا انور بدخشانی نے ایک عمدہ نکتہ بتایا کہ کتابوں کے انتخاب کے رہنما اصول جو بھی ہوں، یہ یاد رکھیں کہ یہ چیزیں منقولی تو ہیں لیکن منصوصی نہیں بلکہ اجتہادی ہیں، ہر زمانے کا اجتہاد آنے والے زمانے کے اجتہاد سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ہم لوگوں کی رہنمائی کے لیے کوئی خاص اصول مقرر نہیں کر سکتے۔ البتہ ہر زمانے کے لکھاریوں کے لیے اسی زمانے کے اعتبار سے متقدمین کے اصولوں کی روشنی میں اصول مقرر کئے جاسکتے ہیں کیونکہ ہر لائق سابق پر موقوف ہوتا ہے۔ جدید لکھنے والے قدیم لکھنے والوں کو دیکھیں کہ وہ کن اصولوں کو اپنائے ہوئے تھے، اسی طرح جدید قارئین بھی سابقہ قارئین کے اصولوں کو اپنا کر اپنے لیے اصول مقرر کر سکتے اور رہنمائی لے سکتے ہیں۔

مجیب الرحمن شامی صاحب نے لکھنے والوں کے لیے اصول بتایا: "تحریر مختصر، سادہ اور ٹو دی پوائنٹ ہونی چاہیے، میں اداریہ اسی طرح سے لکھتا تھا۔" مطالعہ کے حوالے سے شامی صاحب کی رائے ہے:

"جو کچھ بھی اچھا لگے، اسے پڑھ لینا چاہیے، مولانا مودودی کے الفاظ میں "آوارہ

خوانی'' بھی بری چیز نہیں لیکن یاوہ گوئی اور بے ہودگی سے پرہیز کیا جائے تو بہت بہتر ہے، باقی تاریخ، ادب، شاعری اور مزاح جس جس کو جس جس وقت تک چاہیں پڑھتے چلے جائیں۔''

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ہندوستان کے معروف دانشور اور دینی سکالر ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''نئے لکھنے والوں اور نوجوانوں کو میرا مشورہ ہے کہ آوارہ مطالعہ سے بچیں۔ یہ رویہ درست نہیں ہے کہ جو کتاب بھی ہاتھ لگ جائے، اسے پڑھ جائیں بلکہ منتخب مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ دوسری بات یہ کہ صرف ہلکی پھلکی، قصے کہانیوں اور ناولوں کے مطالعہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ سنجیدہ علمی اور دینی کتابوں کو بھی اپنے مطالعہ میں شامل رکھیں۔ دونوں طرح کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اور دونوں کی اپنی اپنی افادیت ہے۔ تیسری بات یہ کہ عمومی مطالعہ کے ساتھ اختصاصی مطالعہ کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کریں، اختصاصی مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک شخصیت کی تمام کتابیں پڑھ جائیں یا کسی ایک موضوع کی تمام اہم کتابوں کا مطالعہ کریں۔ چوتھی بات یہ کہ مطالعہ کے سلسلہ میں صرف اپنے ذوق پر انحصار نہ کریں بلکہ کسی صاحب علم شخصیت کی رہنمائی میں مطالعہ کیا کریں اور وقتاً فوقتاً اس سے مشورہ کرتے رہا کریں بلکہ ایک سے زیادہ شخصیات سے رہنمائی حاصل کرنا بہتر ہوگا۔''

جامعہ ملیہ، دہلی کے پروفیسر اسلامک سٹڈیز ڈاکٹر مفتی مشتاق تجاوری کا کہنا ہے:

''نئے لکھنے والوں کو چاہیے کہ مطالعہ اس طرح کریں جیسے درخت ہوتا ہے۔ جس طرح درخت میں ایک تنا، کچھ شاخیں اور پتیاں ہوتی ہیں، اسی طرح مطالعہ کرنے والے کو ایک موضوع پر گہرائی کے ساتھ پڑھنا چاہیے اور اس کے علاوہ ضمنی موضوعات پر نسبتاً کم اور متنوع چیزیں پڑھنی چاہئیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک موضوع پر پندرہ یا بیس کتابیں پڑھ لیں تو اس میں خاصی مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ جس موضوع سے زیادہ دلچسپی ہو، اس کی زیادہ کتابیں پڑھیں اور اہم ترین کتابوں کو بار بار پڑھیں، کم از کم دس بار۔ اس طرح اس فن میں بصیرت حاصل ہوجائے گی اور اس کے اسرار کھلنے لگیں گے۔ تنا مضبوط کرنے کے ساتھ اس موضوع کے اردگرد مجموعی طور پر پوری علمی دنیا سے واقفیت کا سلسلہ رہے کیونکہ شاخوں اور پتوں کے بغیر درخت بے ڈھب ہوجاتا ہے۔

یہ بھی کوشش کریں کہ مستند اور معروف مصنّفین کی کتابیں پڑھیں اور متوازن فکر کے لوگوں کو پڑھیں کیونکہ پڑھنا آسان ہے لیکن پڑھے ہوئے کو "بے پڑھا" بنانا بہت مشکل۔ حسب توفیق سفر نامہ، افسانہ یا کم از کم ڈائری ضرور لکھنی چاہیے، اس طرح مافی الضمیر کو ادا کرنے کی مشق ہو جائے گی۔"

مولانا محمد سلمان بجنوری نے اپنی تحریر میں ایک اہم نکتہ کو واضح کیا، لکھتے ہیں:

"بہت سے طلبہ یا نیا پڑھنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مطالعہ کرتے ہیں تو یاد نہیں رہتا، ایسی صورت میں مطالعہ کرنے سے کیا فائدہ؟ بات یہ ہے کہ آپ جتنا مطالعہ کرتے جائیں گے، یاد رکھنے کی صلاحیت بڑھتی جائے گی۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی کہا کرتے تھے کہ ذہن کی مثال سوکھی زمین کی طرح ہے۔ زمین میں اگر پہلی بار پانی ڈالا جائے تو پورا خشک ہو جاتا ہے، اوپر نام ونشاں بھی نہیں رہتا لیکن اسی جگہ پر دوبارہ پانی ڈالیں تو اس کے خشک ہونے میں دیر لگتی ہے، پھر سہ بارہ اسی جگہ ڈال دیں تو اور دیر لگتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر اسی زمین پر پانی ڈالا جاتا رہے تو وہ جذب نہیں ہوتا اور اوپر ہی رک جاتا ہے۔ یہی معاملہ حافظے کا ہے کہ شروع میں حافظہ اس کو پیتا ہے اور زیادہ یاد نہیں رہتا لیکن پھر آہستہ آہستہ زیادہ پڑھنے سے یاد رکھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پڑھنے کا مقصد صرف یاد رکھنا ہی نہیں ہے بلکہ ذہنی معیار کو اونچا کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک اور بات یاد رکھیں کہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے نظریات کے بجائے ترمیم کر کے ادب برائے بندگی اختیار کریں، آدمی کا مطالعہ وہی ہونا چاہیے جو اس کے لیے بندگی میں معاون ہو اور گویا دینی اور فکری اعتبار سے درست راستے پر رکھ سکے۔"

ایڈیشنل آئی جی پولیس، پنجاب غلام رسول زاہد قرآن وتفسیر میں پی ایچ ڈی اور خاصے صاحب مطالعہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مطالعہ کو شیئر کرتے ہوئے لکھا:

"مطالعہ کے ارتقا اور زمانی تدریج میں سے اہم مثال قرآن عظیم کی ہے۔ یہ مبارک کتاب زندگی کے ہر مرحلے میں رہنمائی اور حلاوت کا ساماں پیدا کرتی ہے۔ جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے تو اس میں السیوطی اور قرطبی کے بعد شاہ ولی اللہ کے مطالعہ نے

ذہنی تربیت پر گہرا اثر ڈالا۔شاہ صاحب کی حجتہ اللہ البالغہ، الفوز الکبیر اور الانصاف معرکے کی کتابیں ہیں۔حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات ہر دور میں زیر مطالعہ رہے۔ تفاسیر میں معارف القرآن، تدبر القرآن، ضیا القرآن اور تبیان القرآن اہم لگیں۔ متقدمین میں تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر احکام القرآن از قرطبی اور تفسیر کبیر از امام رازی قرآن فہمی کے ہر دور میں مشعل راہ ہیں۔ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ خاصہ کی چیز ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ کی تصنیفات خاص کر خطبات بہاولپور اور علامہ اسد کی کتابیں روڈ ٹو مکہ اور اسلام ایٹ کراس روڈ نے خصوصیت سے متاثر کیا۔"

"سیرت پر سلمان منصور پوری کی رحمتہ العالمین، شبلی کی سیرت النبی، نعیم صدیقی کی محسن انسانیت جبکہ سیرت صحابہ کرام پر حیاۃ الصحابہ، ہیکل کی عمرؓ، شبلی کی الفاروق، طٰہٰ حسین کی چاروں خلفا پر کتابیں، کریگ کی بلال اور عباس محمود العقاد کی تحریر کردہ سوانح قابل قدر مواد فراہم کرتی ہیں۔تصوف پر میری پسندیدہ کتابوں میں شیخ سہروردی کی عوارف العارف، شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم، سید علی ہجویری کی کشف المحجوب، خواجہ نظام الاولیا کی فوائد الفواد، ابریز اور یوسف سلیم چشتی کی تاریخ تصوف شامل ہیں۔اقبال کی فارسی شاعری خاص کر اسرار خودی اور جاوید نامہ سحر انگیز ہیں۔دیوان حافظ اور گلستان سعدی نہایت اعلیٰ پائے کی ہیں۔عمومی کتب میں مختار مسعود کی آواز دوست، سفر نصیب اور لوح ایام کے علاوہ ایس ایم اکرام کی آب کوثر، رود کوثر، موج کوثر مفید ہیں۔خودنوشت میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی، قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ، دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش، احسان دانش کی جہان دانش، مشتاق یوسفی کی زرگزشت اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی اپنا گریباں چاک قابل ذکر ہیں۔امہات کتب جیسے طبقات ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ الخلفا، الملل والنحل اور البدایہ والنہایہ کے ساتھ مقدمہ ابن خلدون لازمی پڑھیں۔ول ڈیورانٹ کی سٹوری آف سویلائزیشن، سٹوری آف فلاسفی اور خاص طور سے لیسنز آف ہسٹری، مولانا علی ندوی کی تاریخ دعوت وعزیمت اور اسماعیل ریحان کی تاریخ امت مسلمہ کو مطالعہ میں ضرور شامل رکھیں۔بیکن کا قول ذہن میں رہے کہ کچھ کتابیں صرف چکھی جاتی ہیں، کچھ تکلفاً حلق سے نیچے اتاری جاتی ہیں اور کچھ کتابیں خوب مزے لے کر چبائی جاتی اور ہضم کی جاتی ہیں۔"

مورخ اور مصنف اسماعیل ریحان کہتے ہیں:

”جن طلبہ کو تاریخ سے دلچسپی ہے، وہ تاریخ ابن خلدون اور تاریخ ابن کثیر کا مطالعہ ضرور کریں۔فن تاریخ کی امہات کتب جیسے تاریخ خلیفہ بن خیاط ،طبقات ابن سعد، انساب الاشراف اور تاریخ طبری میں ہر قسم کی درست ،ضعیف بلکہ باہم متعارض روایات بھی جمع کر دی گئی ہیں، اس لیے بہت سے لوگوں کو ان کتب سے استفادے کا طریقہ معلوم نہیں۔ یہ کتب محققین کو مدد دینے کے لیے ہیں۔ نئے لوگ وہ کتب پڑھیں جن میں معتبر مواد کا خلاصہ ہو یا صحیح غلط کی وضاحت ہو۔ بہت سے لوگ مستشرقین سے متاثر ہیں حالانکہ انہیں محتاط رہ کر پڑھنا چاہیے۔ جیسے جرجی زیدان کی کتاب تمدن عرب کے نام سے مشہور ہے، اس میں بعض جگہ صحابہ کے خلاف زہر بھرا ہے، بعض دیگر مستشرقین کی کتاب میں بھی یہی معاملہ ہے۔“

”اسلم جیراج پوری نے تاریخ الامت کے نام سے کتاب لکھی تھی، یہ صاحب انکار حدیث کے فتنہ کا شکار ہو گئے تھے، انہوں نے مستند احادیث کو بھی قبول نہیں کیا، تاریخ الامت میں بھی ہر قسم کی رطب و یابس چیزیں جمع کر دیں۔ ڈاکٹر خضری بک کی محاضرات التاریخ الاسلامی مشہور ہے، اس کا بغور جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ بکثرت کمزور چیزیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کی سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ پر کتب بھی ایسی بے احتیاطی کا نمونہ ہیں۔ میں قدیم علما میں حافظ شمس الدین ذہبی کی کتب کو سامنے رکھتا ہوں، خاص کر سیر اعلام النبلاء اور تاریخ اسلام جو علوم کا مجمع البحار ہیں۔ علامہ ابن الجوزی، امام ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم ،حافظ ابن حجر اور ملا علی قاری کی کتب بھی پیش نظر رہتی ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب میں شاندار کام ہوا ہے۔ مولانا اطہر مبارک پوری نے اہم کام کیا ہے۔ ہمارے اکثر تاریخی ناول نگاروں کو تاریخ کا کچھ زیادہ علم نہیں ہوتا۔ تاریخی ناول نگار نے اچھی طرح تاریخ پڑھی ہو تو اس کی کاوش سے قارئین میں تاریخی ذوق پیدا ہونے سے انکار نہیں مگر تاریخ شناسی صرف تاریخی ناولوں سے نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بڑی محنت ،توجہ، فراغت وقت، مطالعہ اور اصول تاریخ شناسی درکار ہیں۔“

☆......☆......☆

اردو ادب

سفرنامہ کہاں سے شروع ہونا چاہئے؟

رضا علی عابدی

اردو بے چاری کا عجب معاملہ ہے، نثر کے معاملے میں پیچھے رہی جا رہی ہے۔ جسے دیکھئے غزل کہہ رہا ہے اور جیسے بھی بن پڑتا ہے، اپنے شعری مجموعے شائع کروا رہا ہے۔ نثر کے میدان میں افسانے اور ناول تو لکھے گئے لیکن شعر سے کم۔ تاریخ، تحقیق، سائنس، ادب اور تنقید پر کم ہی کتابیں لکھی گئیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی یادداشتیں لکھیں، کچھ نے اندر کی کہانیاں بیان کیں۔ البتہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادھر اردو ادب میں سفرنامے لکھنے کا رواج فروغ پانے لگا اور کتنے ہی لوگوں نے آس پاس اور دور دراز کے سفرنامے تحریر کئے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

سفرنامے تواتر کے ساتھ آرہے ہیں اور خوشی ہوتی ہے کہ اس بہانے نثر کا بھی بھلا ہو رہا ہے لیکن چونکہ تازہ سفرناموں کی تعداد کم نہیں، ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یوں تو یہ تنقید کرنے والوں کا کام ہے کہ بتائیں یہ کام صحیح ڈھب پر ہو رہا ہے؟ سفرنامے اہتمام سے، قرینے اور سلیقے سے لکھے جا رہے ہیں یا جس کے جو جی میں آرہا ہے، لکھ رہا ہے؟ کیا یہ طے ہو گیا ہے کہ سفرنامے کی حدود قیود کیا ہیں، اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے، لکھنے والا کہاں تک جا سکتا ہے اور کہاں اسے رُک جانا چاہئے؟ اور آخر میں وہ ٹوٹکا جسے میں سب سے پہلا اور اہم عمل سمجھتا ہوں۔ کیا سفرنامے اور روزنامچے میں فرق کرنے کی ضرورت ہے؟ بے شمار احباب صبح و شام کے کوائف لکھتے ہیں جنہیں آپ ڈائری یا روزنامچہ تو کہہ سکتے ہیں، سفرنامہ نہیں۔ ایسی تحریریں میری نگاہ سے گزری ہیں جن میں ہوائی اڈے جانے کی تیاری سے لیکر سامان سوٹ کیس میں بند کرنے کی کارروائی اور پھر ٹریفک کے ہجوم میں

ائر پورٹ پہنچنے کی روداد غیر معمولی تفصیل سے لکھی ہوئی تھی۔ یہ تو خیر ابتدائے سفر کی کیفیت تھی۔ پھر منزل پر پہنچے تو کون کون لینے آیا تھا۔ کون اپنے گھر لے گیا۔ دوپہر کے کھانے میں کیا تھا اور بھابی جان نے ماش کی دال کس مہارت سے پکائی تھی اور یہ کہ صبح ناشتے کا مینیو کیسے تیار ہوا۔

ہمارے ایک مصنف کا دستور تھا کہ سفر پر روانہ ہوتے ہی سفر نامہ لکھنا شروع کر دیتے تھے اور میزبان کے بچوں سے انگریزی نظمیں سننے تک سارا احوال اہتمام سے لکھتے تھے کہ نہ لکھتے تو نسلِ آدم کی تاریخ کا ایک باب ضبطِ تحریر میں آنے سے رہ جاتا۔ یہ اور کسی کے ساتھ ہو یا نہ ہو، اس بے چارے قاری کے ساتھ سراسر زیادتی ہے جو چار سو روپے خرچ کر کے کتاب گھر لے گیا ہے۔

ہمارے ایک اور مصنف نے اقوام عالم کے کتنے ہی گوشوں کا سفر کر کے کتابوں پر کتابیں اس یقین کے ساتھ لکھیں کہ کوئی ان کی روداد کی تصدیق کرنے وہاں نہیں جائے گا۔ ایک اور قابلِ احترام مصنف نے اس تواتر سے سفر نامے لکھے کہ انہوں نے اپنا قلمی نام مسافر رکھ لیا۔ وہ سفر کے دوران روز کا احوال اسی روز لکھ ڈالتے تھے اور آخر میں پورا پلندہ اپنے ادارے کو بھیج دیتے تھے برائے اشاعت۔ ان کی واپسی تک سفر نامہ شائع ہو چکا ہوتا تھا۔

پہلے پہل لوگ دور دراز علاقوں کا سفر کر کے روداد لکھتے تھے۔ حال ہی میں یہ نیا اور عمدہ چلن پڑا کہ اپنے ہی ملک کے گوشے گوشے میں جا کر اپنے ہی گھر کی کہانی کہہ سنائی۔ خاص طور پر ہمارے مہم جو سیاح جو اس کے ساتھ اہل قلم بھی تھے، بڑا کام کر گزرے۔ ان کے کارناموں کو سراہا جانا چاہیئے۔ بعض احباب نے اپنے سفر ناموں کو سفر کی روداد سے بڑھ کر نثری ادب میں اپنا حصہ ڈالا اور مسافت کی چاشنی میں زبان وادب کے لطف کی آمیزش کی جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

مغرب میں ٹریول بکس لکھنے کا چلن عام ہے۔ وہ اسے ٹریولاگ کہتے ہیں اور بجا طور پر کہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جن دنوں ہماری طرف کا ہر شخص پیرس، لندن اور نیو یارک کے سفر نامے لکھ رہا تھا اور ہم ایفل ٹاور کے قصیدے پڑھ پڑھ کر تھک چکے تھے، میں ہر ایک سے کہا کرتا تھا کہ کوئی ٹمبکٹو کا سفر نامہ کیوں نہیں لکھتا۔ ہمارے ہاں دور دراز علاقوں کی سیر کرنے کا رواج ہی نہیں، اس لیے

صحرائے اعظم کا سفر نامہ کوئی کیوں لکھے، منگولیا کا حال کوئی کیوں بیان کرے۔ لدّاخ کی مسلمان آبادی کا تذکرہ کوئی کیوں کرے؟ میں خود کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا تھا لیکن یہاں پہنچ کر جو مثال ذہن میں آئی اسے بیان کرنے پر مجبور ہوں۔ بیس بائیس برس پہلے جو میں پہلی بار افریقہ کے ساحل سے لگے ہوئے چھوٹے سے جزیرے ماریشس گیا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بالکل ہمارے جیسے لوگ، ہمارے جیسا کھانا پینا اوڑھنا بچھونا، کھیلنا اور غزلیں کہنا۔ اُس وقت میں نے کہا کہ سفر نامہ لکھنے کے لیے کرۂ ارض پر اس سے زیادہ مناسب مقام نہیں ہوسکتا۔ اس پر میں نے 'جہازی بھائی' کے نام سے سفر نامہ لکھا جسے پڑھ کر میرے بزرگ محمد خالد اختر مرحوم نے کہا تھا کہ میں نے اس سے بہتر سفر نامہ نہیں پڑھا۔

اس بیان میں کچھ مبالغہ اور کچھ محبت کی ملاوٹ تھی مگر بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ماریشس کے سفر نامے میں حیرت زدہ کرنے والے اتنے حقائق یک جا تھے کہ اس تبصرے کا جواز بنتا ہے۔ ایک سفر نامہ ہی کیا، اکثر تحریروں کے بارے میں اس بات کو کلیہ سمجھنا چاہیے کہ ان میں کسی بھی شکل میں تحیّر اور استعجاب ہو۔ وہ حیران کریں، ذہن کے کسی گوشے میں نئے چراغ جلیں اور اندر کہیں سے کوئی نئی کرن پھوٹے۔ یہاں میں اپنے استدلال کو دو فقروں میں بیان کرسکتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ سفر نامہ گھر کی دہلیز سے نہیں تو کہاں سے شروع ہونا چاہیے۔ میرا جواب ہوگا: سفر نامہ وہاں سے شروع کیجیے جہاں سے حیرت شروع ہوتی ہو۔

☆......☆......☆

ادب پارے

میاں داد خان سیاحؔ کی جعل سازی

وہ شاعر جو جعلی نوٹ بنانے کے ماہر تھے! عرصہ تک انگریز سرکار کو چونا لگاتے رہے!

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزری گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہ شعر ضرب المثل کی طرح مشہور ہے لیکن بہت کم لوگ اس کے شاعر کے بارے میں جانتے ہیں۔

یہ شعر میاں داد خان سیاح کا ہے جو مرزا غالب کے دوست اور شاگرد تھے۔ ان کا اصل وطن اورنگ آباد تھا، (۳۰-۱۸۲۹) میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان نے گردش روزگار کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر سورت میں سکونت اختیار کرلی۔ میاں داد خان سیاحت کے بہت شوقین تھے۔ ابتدا میں عشاق تخلص کرتے تھے۔ غالب نے ان کے شوق سفر کی مناسبت سے تخلص سیّاح رکھا۔ میاں داد خان سیاح ایک انتہائی دلچسپ اور عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ انگریز کے زمانے میں انہوں نے انگریز سرکار کو خوب چونا لگایا۔ اس زمانے میں نہ جانے کہاں سے انہوں نے نقلی کرنسی نوٹ بنانا سیکھ لیے تھے اور نقلی بھی ایسے اصلی جیسے کہ ایک عرصے تک ان جعلی نوٹوں کے ذریعے انتہائی عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے۔ کہتے ہیں سیاح کا ایک دیوان کسی میر صاحب کی بکری کھا گئی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت میں وفات ہوئی۔ سیاح کی ایک تصنیف ''سیر سیاح'' ہے۔ یہ ان کا شمالی ہند کا سفر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی تصانیف ان سے منسوب ہیں۔

☆......☆......☆

مسافرانِ آخرت

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خانؒ

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۱ء کو پچاسی برس کی عمر میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان ۱۹۳۶ء کو ہندوستان کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے،آپ کا تعلق ایک اعلیٰ نسب سپاہ گر گھرانے سے تھا۔ ۱۹۵۲ء میں آپ اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گئے،ڈلفٹ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی جامعہ کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ یورپ چلے گئے، پندرہ برس یورپ میں رہنے کے دوران آپ نے مغربی برلن کی ٹیکنیکل یونیورسٹی، ہالینڈ کی یونیورسٹی آف ڈیلفٹ اور بیلجیئم کی یونیورسٹی آف لیوؤن میں تعلیم حاصل کی، ہالینڈ میں قیام کے دوران آپ نے وہاں کی ایک مقامی لڑکی ہنی سے شادی کی جواب ہنی خان کہلاتی ہیں اوران سے آپ کی دو بیٹیاں ہوئیں۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب مغرب کی عشرتیں چھوڑ کر وطن کا قرض چکانے کے لیے پاکستان آئے اور ایٹم بم بنانے کے خواب کی تعبیر قوم کو کامیابی کے ساتھ عطا کی،اُسی کا تصدّق ہے کہ آج پاکستان اپنے آپ کو دشمن کی یلغار سے محفوظ و مامون تصور کرتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میزائل ٹیکنالوجی کی جانب توجہ مرکوز کی اور وطن عزیز کو غوری، عنزہ، شاہین اور غزنوی جیسے مہلک اور جدید ترین میزائلوں کا تحفہ بھی دیا۔ انہی خدمات کی بنا پر آپ کو ستارۂ امتیاز، ہلالِ امتیاز اور نشانِ امتیاز کے اعزاز سے نوازا گیا۔ پاکستان کا دفاع ناقابلِ تسخیر بنانے والے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پوری قوم تو ہیرو اور قائداعظمؒ کے بعد آپ کو اپنے محسن اعظم کے طور پر یاد کرتی ہے لیکن آپ کے ساتھ اہلِ اقتدار کا سلوک اچھا نہ رہا،ان کے گزشتہ کئی ماہ و سال بڑی آزمائش میں گزرے، وہ اس پر انتہائی شکوہ کناں رہے،اس کا اظہار ایک شعر میں کرتے ہیں:

گزر تو خیر، گئی ہے تری حیات قدیرؔ ستم ظریف، مگر کوفیوں میں گزری ہے

اہلِ اقتدار آپ کی صلاحیتوں سے تعلیمی، صنعتی اور سائنسی میدانوں میں فائدہ اٹھا سکتے تھے،آپ کی ایجادات پاکستان کو مالا مال کر دیتیں، صنعتی شعبے کو ترقی مل سکتی تھی لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

آپ کو ادب اور شاعری سے شغف تھا، بے شمار شعر زبانی یاد تھے، قرآن کریم کا مطالعہ بھی جاری رکھتے، تاریخ پر گہری نظر تھی۔ آپ کی یادیں، آپ کی باتیں اور کارنامے ہمیشہ یاد رہیں گے۔